ناولٹ

نسیم ناز

دل سے دھواں اٹھا

"اسے بیٹی! ذرا میرے ساتھ مل کر یہ کام کرلو۔ ایک طرح کا ہنر سیکھ لو گی تو اس کے پیسے بھی ملیں گے اور تمہیں یہاں رکھنا مدد ہے۔ تم اس کے پیسے بھی ملیں گے اور تمہیں یہاں رکھنا پڑھنے کا شوق ہے تو میں کسی طرح کی فیس نہ دے پاؤں گی۔ پڑھنے کا شوق ہے تو میں کسی طرح کی فیس نہ دے پاؤں گی۔ ہاں سے کے لیے تیار نہیں۔ جب جی چاہے کام ہاں سے کے لیے تیار نہیں۔ جب جی چاہے کام سے اٹھ جانا۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ وہاں جاتے ہوئے اپنی نانی سے سے اٹھ جانا۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ وہاں جاتے ہوئے اپنی نانی سے یوں مخاطب ہوئے۔ یوں مخاطب ہوئے۔

"نانی جان! مجھے ہدایت نہیں لینے کا شوق ہے۔ جس طرح چاہیں "نانی جان! مجھے ہدایت نہیں لینے کا شوق ہے۔ جس طرح چاہیں سے اپنی پسند کا کام سکھا دیں۔ ہدایت لے سکھا دیں۔ پڑھنے سے اپنی پسند کا کام سکھا دیں۔ پڑھنے لکھنے کا شوق ہے تو ضرور پڑھوں گی۔ لیکن ابھی کچھ نہیں لکھنے کا شوق ہے تو ضرور پڑھوں گی۔ لیکن ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی کہ پڑھنے لکھنے کے علاوہ کیا کچھ اور سیکھ سکوں گی۔ اس کی مسئلہ ہے

کہیں بھی رہتے، فکر ان کے گھر کی ہوتی تھی۔ دوا یوں تو بہت کام کرتی تھیں مگر انہیں کھانا پکانے کی محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ دوا کے گھر کے پچھلے حصے میں سرونٹ کوارٹر تھے۔ دوا نے ان کوارٹروں کو دو فیملیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ براہ خدا ان فیملیوں کی عورتیں دوا کا بیشتر کام کر جاتیں۔ اشرفی روتی پکار رہی ہے تو اس کی بہو سالن بھون رہی ہے۔ چھٹی جتو برتن دھو رہی ہے تو بڑی صفو گھر کی صفائی میں لگی ہے۔ دوا زبان ہلائیں تو سارے کام ہو جاتے۔ وہ خود تو بیٹھے ہوؤں کے کاموں میں مصروف رہتیں۔ سلائی پر بیٹھتیں تو پوتیوں کی شلواروں سے لے کر بہوؤں کے بلاؤز اور بیٹوں کے کرتے تک سی ڈالتیں۔ سیروں دودھ کے حلوے بنا بنا کر بہوؤں کے حوالے کرتیں۔ ڈھیروں آلوؤں کے بیچ میں بیٹھی چھیل بناتی اور سکھا کر حساب سے بیٹوں کے گھر بھجوا دیتیں۔

ہر کام میں اصفیہ کی شرکت ضروری تھی۔ بڑے چچا صفی اللہ سمجھلے معین ان سے چھوٹے کلیم سبھی اپنے آفس جانے سے پہلے دوا کے پاس سلام کرنے آتے۔ کبھی کبھی ملکہ اکثر رات کو سارا گھر دوا کے ساتھ کھانا کھاتا۔ بڑی نکھلی اور منجھلی اپنے اپنے گھر سے پکا پکایا کھانا لے آتیں۔ تمام بچے سے فرمائشیں جمع کر کے لائے جاتے اور خوب باتوں اور ہنسی قہقہوں کے درمیان کھانا کھایا جاتا۔

معین چچا سے سب لوگ ڈرتے تھے۔ ان کی آواز بھی کافی گھن گرج والی تھی۔ اور وہ کم بولتے مگر جب بھی بولتے کسی دوسرے کو ان کی بات رد کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ تینوں بھائیوں کی بہت سی اولادیں تھیں اور اصفیہ کو عرصے تک یہ علم نہ ہوا کہ کون کس کا بیٹا بیٹی ہے۔ اسکول سے سب تقریباً ساتھ ہی گھر آتے۔ ہلڑ مچاتے اور بھاگتے دوڑتے لڑکیاں سب ہی بڑی تھیں وہ کھسر پھسر کرتی اور دبی دبی ہنسی ہنستی رہتی تھیں۔ دوا کے گھر کے صحن میں دروازہ تھا۔ سب لوگ وہیں سے آتے جاتے تھے اور شام کو اسی صحن میں سب لڑکیاں بیڈمنٹن یا باسکٹ بال کھیلتی تھیں۔ لڑکے دن میں ہی جمع ہوتے۔ لڑکیاں کھیلتے میں دوا کے کام بھی کرتی جاتی تھیں۔

"یہ تولیہ الگنی پر ڈال دو شفق!"

"لوٹا بھر کر دینا مجھے۔"

"جانے نماز بچھا دو۔"

"موتیا کی کلیاں توڑ لانا تھوڑی سی۔"

بلقیس پلنگ میں ہاتھ لٹکا کر چلا کر کہتی اٹھاؤ۔

بڑی چچی یا علیم چچی کام کی زیادتی لڑکیوں کی لاپروائی کا رونا روتیں۔ دوا فوراً انہیں تسلی دیتیں۔

"کیا کام ہے میں کروا دوں گی۔"

اکثر بڑی چچی کے کام منجھلے چچا کی بیٹیوں کے ذمے انجام پاتے۔ اور علیم چچا کے گھر کے کام بڑے چچا کی بیٹیاں کرتیں یا سب مل جل کر ایک دوسرے کے کام کرتیں اور یوں تینوں بہوئیں دوسرے کی لڑکیوں سے خوش اپنی بیٹیوں سے نالاں رہتیں۔ مگر دوا کسی کو کسی پر فوقیت نہ دیتیں اور سلام آدم سے ہو جاتا۔ اصفیہ چونکہ دوا کی مہمان تھی۔ انہی کی ذمہ داری۔ اسے دوا اپنے کمرے میں ہی سلاتی تھیں۔ وہ کسی سے بھی جلد بے تکلف نہ ہوئی۔ گو کہ دوا نے اسے سب سے ملوا دیا تھا۔ مگر وہ کٹی کٹی رہتی۔ جمیلہ، بلقیس، شفق، ثنا، ثنا اور علیحہ۔ دوا کی نواسیاں بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔ اصفیہ کسی سے بھی دوستی نہ ہوئی۔ وہ عموماً خاموش رہتی اور سب کو اپنی تیز چمکیلی سیاہ آنکھوں سے گھورتی رہتی۔ ہیں! کتنیں دن اصفیہ نے خاموشی فرمانبرداری اور صبر کے ساتھ گذار دیے تو دوا نے اشرفی کو بھیج کر اپنی بیٹی شاہین کو بلوایا۔ جو کسی دوسرے مگر قریب کے محلے میں رہتی تھیں۔

"اے ہے۔ نگوڑ ماری بے زبان بچی۔ بالکل سیدھی۔ اللہ میاں کی گائے۔ نہ تیزی طراری۔ نہ شوخی۔ میں کہوں یہ ہو کیا گیا ہے اشفاق کی دلہن کو۔ بچی کو بدنام کر رکھا ہے کہ کسی کے بس کی نہیں۔ اشفاق کہہ گئے تھے دس پندرہ دن اسے پرکھ لیں۔ مہینہ بھر بعد آ کر دیکھوں گا۔ اگر سدھرنے کے آثار ہوئے تو ٹھیک ورنہ لے جاؤں گا۔" دوا بڑبڑاتی تھیں تو بغیر رکے بولے جاتیں۔

"مگر مجھے کس لیے بلایا ہے آپ نے اماں؟" شاہین پھپھو سے زاری سے بولیں۔ "میں نے گرم کپڑوں کے بکس نکلوانے تھے دھوپ دینے کے لیے کہ اشرفی آ کر سر پر سوار ہو گئی کہ چلو جلدی۔ سارے کپڑے یونہی چھوڑ کر آئی ہوں۔ گھر الگ تھی میں۔"

"ادھر۔ پھٹکی پڑے میری عقل پر۔" دوا نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اے بچی! خط لکھوانے کو بلوایا تھا۔"

"تو اصفیہ خط بھی نہیں لکھ سکتی کیا؟"

"لو۔ اس سے کیا لکھاؤں۔ تم سے ہی لکھوانا چاہتی تھی میں۔ جاؤ اشرفی بڑی دلہن سے کاغذ اور قلم تو مانگ لاؤ۔"

"اخروٹان! کاغذ قلم بھی آپ کے پاس نہیں۔" پھپھو بے حد بیزار تھیں۔ "میں تو کہتی تھی اسما کے رشتے کے لیے میں آپ نے بلوایا ہے۔ وہ تو اس دن بڑی بی آئی تھیں۔ انہوں نے کچھ کہا نہیں؟"

"اے کہاں۔ وہ بڑی بی تو بہت تیز نکلیں۔" دوا انہیں بڑی بی کی چالاکی اور پوتے کے قصے سنانے لگیں۔ پھر تو پھپھو واقعی بیزار ہو گئیں اور انہیں گھر جانے کی اس قدر جلدی ہوئی کہ بہت افراتفری میں اصفیہ کے آگے شرط لکھا گیا۔ انہیں ہر طرح سے اطمینان دلانے کے بعد آنے سے منع کر دیا گیا۔

"بچی بہت آرام سے ہے۔ ہر کام سیکھ رہی ہے۔ اسکول میں بھی داخلہ کروا دوں گی۔ اشفاق دلہن کو غریبان دو دو بچوں کو پیار۔"

خط کو کئی دن ہو گئے تھے۔ سخت گرمی کی دوپہر میں دوا نے نماز پڑھ کر سلام پھیرا تو اصفیہ کا پلنگ خالی دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے انہوں نے وضو کے لیے جاتے ہوئے اسے نماز کی نگرانی کی تھی تو وہ بستر پر لیٹ کر سخت نیند آنے کا اظہار کر رہی تھی۔ اتنی دیر میں کہاں چلی گئی۔ انہوں نے دوسرا کمرہ جھانکا۔ پھر اپنے ٹھنڈے کمرے سے باہر قدم نکالا۔ لوکے تھپیڑے نے ان کا استقبال کیا۔ وہ اف اف کرتی اسے پکارتی رہیں۔ پچھلی طرف کے چھوٹے سے برآمدے میں جہاں بہت کم کسی کا گذر ہوتا تھا۔ اور صرف بارشوں کے موسم میں پلنگ کھڑے کیے جاتے تھے۔ ایک پلنگ پر وہ اوندھی لیٹی تھی۔ اس کے برابر عزت، رجب اور امین بیٹھے تھے۔ سامنے زمین پر فخر اور فیض گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی اصفیہ کی ہدایتیں۔

"دیکھو۔ دیکھ کے۔ چت کرو چت۔ لاک لگاؤ فیض۔ ارے ٹانگ بچا۔ ٹانگ بچا کے دھوبی پٹر مارو بیوقوف۔ کیا کرتا ہے۔ مرے گا کیا۔ دھت تیری۔ داؤ کر رے۔ ہے۔ گرا کر داؤ لگا۔ ہاں۔ ایسے۔ شاباش۔ اب لگا دے انوکی لاک۔ اوفوہ۔ قینچی لگا۔ لگا قینچی۔ سستی مارے کچھ نہیں کر سکتے تم۔"

اس کی ہدایتوں کے ساتھ امین، رجب اور عزت کی ہمت بندھانے والی چیخیں۔ رجب اور اصفیہ فیض کے حمایتی تھے جبکہ امین اور عزت فخر کے ساتھی۔ بے حد و

بے حساب حیرت و تعجب کے سمندر میں غرق رہنے کے بعد دوا کچھ سنبھلیں اور انہوں نے فخر کو شیر آور میں بدلنے جو فیض کی اچھی خاصی پٹائی کرنے کے بعد اسے قابو کر کے چت لگانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ جبکہ اصفیہ فخر کو بے ایمانی کرنے کے لیے عزت اور امین پر للکار رہی تھی۔

کمرے میں وہی خلفشار اور سناٹا تھا۔ انہوں نے پاؤں پٹخ پٹخ کر تینوں پر پیٹھ کی اور اصفیہ کو پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہا۔

"یہ۔ یہ تم نے کہاں سے سیکھا بیٹی؟" ان کا لہجہ بہت نرم تھا۔

"ننا کے گھر سے۔" نہایت بشاش لہجے میں اصفیہ نے انہیں آگاہ کیا۔ "ماموں جان کے چار بیٹے ہیں دوا۔ مگر میں بہت اچھے رسلر۔ ایسے ایسے داؤ لگاتے ہیں کہ بس مزا ہی آ جائے۔"

"تو تم ان سے عمر میں بھی بڑی تھیں کیا؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے نہیں۔ کہاں۔" وہ بہت مایوس لہجہ تھا۔ "وہ تو اس قدر بے ایمان ہیں کہ بس کیا کہوں۔ اپنی اپنی جوڑی بنا کر کھیلتے تھے۔ ہمیں ریفری بناتے تھے۔ چار تو ہیں گل۔ دو جوڑیاں بنتی تھیں۔ پھر جو کشتی ہوتی تھی۔ آہا ہا ہا۔"

"اگر ان کا پانچواں بھائی ہوتا تو تمہاری بھی جوڑی بن سکتی تھی نا اصفیہ آپا!" عزت نے فرش پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

دوا نے عزت کو گھور کر دیکھا اور کہا۔ "ہش۔"

"سچ دوا۔ امین نے سر اونچا کر کے وثوق سے کہا۔ "اصفیہ آپا کو کتنے داؤ آتے ہیں۔ ہم سب ان کے پیچھے ہیں۔ یہ ہمیں کوچنگ کرتی ہیں۔ استاد بن گئی ہیں ہماری۔"

اصفیہ مارے انکسار کے کچھ شرما گئیں۔ دوا بے چاری ماتھے پر ہاتھ رکھ کر نماز کی چوکی پر بیٹھ گئیں۔ "اور کیا کیا سیکھا تم نے نانی کے گھر؟"

"جی۔ وہ۔ کچھ نہیں۔" اصفیہ نے سر جھکا لیا اور منمنانے لگی۔ "یہ تو بس۔ ایسے ہی۔ وہاں کوئی لڑکی تو تھی نہیں۔ پھر کس کے سہیلی بناتے ہم۔"

اس نے نہایت بے چارگی سے دوا کو دیکھا۔ دوا اس کی مجبوری سمجھ گئیں۔ انہوں نے اسے ڈانٹا نہیں۔ کچھ کہا نہیں۔ بس لڑکوں کو تنبیہہ کی کہ خبردار اگر آئندہ کشتی لڑتے پائے گئے تو بہت پٹیں گے۔" دوا صبح کی۔ نماز پڑھ کر سو جاتی تھیں۔ فجر

کے وقت نماز کے بعد وہ اصفیہ کو بلاتی تھیں۔ تاکہ وہ بھی نماز کی عادی ہو جائے۔ ایک روز اصفیہ نے بہت تمیز سے ان سے پوچھا کہ وہ نماز کے بعد سو نہیں سکتی۔ اگر وہ اجازت دیں تو وہ ذرا باہر ٹہل آیا کرے۔ دوا نے اجازت دے دی مگر صحن میں بالان میں اشارہ پیشے کی طرف نہیں بھی ٹہل قدمی کی اجازت تھی۔ صحن کے اندر ہار سنگھار موتیا چنبیلی اور نیبو کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ ادھر ادھر روٹ کوارٹروں کے آگے تو آم جامن امرود بھی لگے تھے۔ اس دن وہ نماز کے بعد سو گئی تھیں۔ اشرفی بوا اکران کے پائنتی بیٹھ گئیں۔ دوا نے غنودگی کے عالم میں ہی پوچھا۔

"کیا ہے ری؟"

"اماں جی۔ وہ آپ کی۔ جی وہ۔"

دوا اس کی ہچکچاہٹ سے سمجھ گئیں ——— کہ کوئی خاص بات ہے۔ آنکھیں کھول کر بولیں "ہاں۔ اب کہہ بھی دو!"

"جی۔ وہ اصفیہ بی امرود کے پیڑ پر چڑھ گئی ہیں۔ کچے امرود توڑ کر۔ وہ جی۔ سارے بچے بچے لڑ رہے ہیں۔ اور عزت میاں بھی اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کوئی گر گرا جائے تو؟"

دوا نے سرہانے سے عینک اٹھا کر لگائی۔ تسبیح اٹھائی جھک کر سلیپر تلاش کیے۔ اور اشرفی سے کہا۔

"تم چلو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

باہر صبح کا نہایت حسین سماں بکھرا ہوا تھا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ ہلکی سی دھندلی سی غبار آلود کرنیں بلکیہ اندھیرے میں روشنی پھیلانے کی کامیاب کوشش کر رہی تھیں۔ موتیا کے پھول باسی ہو گئے تھے اور پتوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ ہار سنگھار کے پیڑ کے نیچے سفید پنکھڑی اور پیلی ڈنڈی کے بے شمار پھول بکھرے ہوئے تھے۔ صحن میں رات کی رکھی ہوئی گول میز اور کرسی دیسے ہی دھری تھی اور میز پر ایک خالی پیالی چوں کی توں موجود۔ شام کو بیڈ منٹن کا نیٹ جو جمیلہ نے باندھا تھا ابھی تک ویسے ہی بندھا ہوا تھا اور اس میں شٹل کاک پھنسی ہوئی تھی۔ دوا تیزی سے تسبیح گھماتی شاگرد پیشے کی جانب جا رہی تھیں۔ جہاں سے لڑکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ امرود کے درخت کے آخری سرے پر اصفیہ ایک شاخ سے کمر ٹکائے دوسری پیر ہوا میں جمائے اور اونچی شاخ سے امرود توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نیچے سے برابر ہدایتیں جاری تھیں۔

"یہ نہیں۔ وہ والا۔ اس طرف موٹا سا ہے تمہارے ہاتھ کے نیچے۔"

سب لڑکیاں سر اوپر کیے اصفیہ کو دیکھ رہی تھیں جس کے سر پر سوت کی کرنوں سے جگمگاتا ہالہ سا بنا دیا تھا۔ اس کے بال ہلکی سی سرخ رنگ کی طرح ہو گئے تھے۔ جسم اور عزت بھی درخت پر چڑھ گئے تھے۔ عزیز شفق انہیں تلامذہ سے دیکھ رہی تھی نیچے زمین پر پکے امرودوں کا فرش سا بچھا ہوا تھا۔ دوا نے نہایت تاسف سے یہ منظر دیکھا اور اشارے سے جمیلہ کو بلایا۔ وہ کچھ ڈری ہوئی آئی تو بولیں۔

"بیٹا! تم نے تو کبھی بتایا نہیں امرود تم کو اتنے پسند ہیں؟"

اس دن اشرفی بوا کے بیٹے نے ڈھیروں امرود توڑے اور دوا نے ٹوکریوں میں بھر کر ہیروں کے پاس بھیج دیئے۔ خود انہوں نے جو امرود اپنے گھر کے لیے رکھے تھے وہ اصفیہ نے دن بھر میں ختم کر دیئے۔ اشرفی نے بتایا کہ جمیلہ، ثنا اور رابعہ کے گھر بھی امرود گئے تھے وہ کسی بچے نے چکھے تک نہیں۔ اس کے اگلے دن اصفیہ پیٹ کے درد میں مبتلا رہی اور روتی رہی۔ نیز جتنی دوائیں دوا نے اسے ابال کر پیس کر دیتی رہیں۔ وہ مستقل مزاجی سے کھاتی پیتی رہی۔ دو تین دن بعد نمنوں گھروں میں بھیجے گئے امرودوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے میں ڈال دیے گئے۔

اس کے دو تین دن بعد دوا نے اصفیہ کو اسکول میں داخل کرا آئیں۔ مگر اس طرح بھی ان کی فکریں کم نہ ہوئیں۔ اسکول سے مسلسل اس کی شکایتیں آنے لگیں۔ وہ اسکول جانے میں لیت و لعل کرتی۔ اسے پابندی سے اسکول بھیجنے کے لیے دوا کو بہت محنت کرنا پڑتی۔ اسے جگا کر ناشتہ دینا۔ کپڑے تیار رکھنا۔ ورنہ یہی بہانا کافی تھا اسکول سے غیر حاضری کا۔ فجر کے بعد دوا کے آرام کا وقت اب اصفیہ کی تیاری میں گزر جاتا۔ اس کے آنے کے بعد بھی وہ اسی فکر میں غلطاں رہنے لگیں۔ ان کے پوتے جو اصفیہ سے بہت مانوس اور متاثر تھے۔ نگاہ چوکی نہیں کہ استاد شاگرد مل کر نت نئی شرارتیں ایجاد کرتے۔ ان کے گھر کا نظام بھی اب پہلے جیسا نہ رہا۔ اب تو صغنی کی دلہن بھی اصفیہ کے طور طریقوں پر دبی زبان سے اعتراض کرنے لگیں منجھلے چچا معین کی بیوی بہت خاموش طبیعت تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیاں ثنا اور حنا بھی سنجیدہ اور کم گو سی تھیں۔ البتہ کلیم چچا کی بیوی اصفیہ سے دوستانہ طرز اپنائے رہتیں۔ اس کی باتوں پر خوب ہنستیں اور اپنے بچپن کی شرارتوں کے

قصے سناتیں۔ اسی لیے اصفیہ ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ وہ اوپر کے حصے میں رہتی تھیں اور ان کے پاس بھی کئی کمرے اور بڑے بڑے صحن تھے۔ صبح بچوں کے اسکول جانے کے بعد وہ اپنا کام نمٹا کر کسی جیٹھانی کے پاس آ جاتیں۔

وہ سلائی میں اور کڑھائی میں ماہر تھیں۔ اصفیہ کی ان سے دلچسپی دیکھ کر دوا نے پیشے سے انہیں اشارہ کیا کہ اصفیہ کو مشین پر بٹھائیں اور کڑھائی سکھائیں۔ مگر اصفیہ ان کے ہاں جا کر دیواروں منڈیروں پر تیز چلنے کی مشق کرتی رہتی۔ شفق کی گھمت نہ دیکھی جاتی۔ بلیم ڈری ڈری آوازیں میں چیخیں مارتی۔ الغرض سب لڑکے مچ مچ کر کے بیاں بھاتے دوسرے بڑھاتے۔ کلیم بھی فراخ دلی سے مسکراتی رہتیں۔

دوا کو غم کھوٹی۔ انہوں نے بہو سے باز پرس کی۔ وہ خاصی شرمندہ ہوئیں۔ مگر اصفیہ پر حکم چلانا یا اس سے کچھ کہنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ دوا اب اصفیہ کے مستقبل سے خاصی مایوس ہو چکی تھیں۔ اس کے سدھرنے کی کوئی علامت نظر نہ آتی البتہ ان کے پوتے خوب ٹریننگ لے رہے تھے۔ خطروں کا مقابلہ کرنا خطروں سے کھیلنا۔ دیواروں پر دوڑنا چھتوں پر کودنا۔ درختوں سے چھلانگیں۔ دوا کی نیند شتابیاں پھر شروع ہو گئی تھیں۔ چاندنی رات میں آنکھ مچولی ہونے لگی جس کی وجہ سے صحن میں دھری صراحیاں۔ برآمدوں میں رکھی کرسیاں اور چھپر ترے پر رکھے گملے ادھر ادھر لڑھکتے۔ جونہی آنکھ مچولی کا شور دوا کے کانوں میں پہنچتا۔ وہ سر تھام کر بیٹھ جاتیں۔ بس اب صراحیوں کی خیریت نہیں۔ گئے میرے سب گملے۔ وہ بڑبڑا کر رہ جاتیں۔

ادھر اشفاق میاں کا خط آیا تھا وہ اپنی بچی کے بے حد شکر گزار تھے۔ جنہوں نے ایک جن کو قابو کر لیا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی حج کرنے جا رہے تھے۔ اس سعادت کے بعد دوسری سعادت یعنی اپنی بچی کی زیارت کے لیے آنے کا لکھا تھا۔ دوا جو چند دنوں سے انہیں بلوانے کے لیے خیالوں میں تبصرہ باندھ رہی تھیں۔ ایکا ایکی پژمردہ ہو گئیں۔

"چلو چھٹی ہوئی۔ اب دو ڈھائی مہینے اور جھگتنا ہے۔"

یہ سوچ کر وہ بے حد ملول اور دل گرفتہ ہو گئیں۔ اچانک اصفیہ کو خیال آیا کہ ثنا کے گھر میں ماموں جان سے جو موسیقی کا سبق لینا شروع کیا تھا۔ وہ ادھورا ہی رہ گیا۔ کہیں بھول نہ جائے۔ ماموں جان ایک اچھے موسیقار اور گلوکار تھے مگر شہرت سے دور ہی بھاگتے تھے۔ اپنی گھریلو محفلوں میں ان کی آواز اور دھنوں کی دھوم تھی۔ ایک روز اصفیہ سے وہ شرط ہار گئے۔ اور مجبوراً انہوں نے اپنی نٹ کھٹ بھانجی کو موسیقی کی تعلیم دینا شروع کی۔ گو وہ بھی جم کر ایک جگہ بیٹھنا نہ جانتی تھی۔ اور اسی لیے ان کے ہاں بھی کئی کمرے اور بڑے بڑے صحن تھے۔ صبح بچوں کے اسکول جانے کے بعد وہ اپنا کام نمٹا کر کسی جیٹھانی کے یا ساس کے پاس آ جاتیں۔

وہ سلائی میں اور کڑھائی میں ماہر تھیں۔ اصفیہ کی ان سے دلچسپی دیکھ کر دوا نے پیشے سے انہیں اشارہ کیا کہ اصفیہ کو مشین پر بٹھائیں اور کڑھائی سکھائیں۔ مگر اصفیہ ان کے ہاں جا کر دیواروں منڈیروں پر تیز چلنے کی مشق کرتی رہتی۔ شفق کی گھمت نہ دیکھی جاتی۔ بلیم ڈری ڈری آوازیں میں چیخیں مارتی۔ الغرض سب لڑکے مچ مچ کر کے بیاں بھاتے دوسرے بڑھاتے۔ کلیم بھی فراخ دلی سے مسکراتی رہتیں۔

دوا کو غم کھوٹی۔ انہوں نے بہو سے باز پرس کی۔ وہ خاصی شرمندہ ہوئیں۔ مگر اصفیہ پر حکم چلانا یا اس سے کچھ کہنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ دوا اب اصفیہ کے مستقبل سے خاصی مایوس ہو چکی تھیں۔ اس کے سدھرنے کی کوئی علامت نظر نہ آتی البتہ ان کے پوتے خوب ٹریننگ لے رہے تھے۔ خطروں کا مقابلہ کرنا خطروں سے کھیلنا۔ دیواروں پر دوڑنا چھتوں پر کودنا۔ درختوں سے چھلانگیں۔ دوا کی نیند شتابیاں پھر شروع ہو گئی تھیں۔ چاندنی رات میں آنکھ مچولی ہونے لگی جس کی وجہ سے صحن میں دھری صراحیاں۔ برآمدوں میں رکھی کرسیاں اور چھپر ترے پر رکھے گملے ادھر ادھر لڑھکتے۔ جونہی آنکھ مچولی کا شور دوا کے کانوں میں پہنچتا۔ وہ سر تھام کر بیٹھ جاتیں۔ بس اب صراحیوں کی خیریت نہیں۔ گئے میرے سب گملے۔ وہ بڑبڑا کر رہ جاتیں۔

ادھر اشفاق میاں کا خط آیا تھا وہ اپنی بچی کے بے حد شکر گزار تھے۔ جنہوں نے ایک جن کو قابو کر لیا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی حج کرنے جا رہے تھے۔ اس سعادت کے بعد دوسری سعادت یعنی اپنی بچی کی زیارت کے لیے آنے کا لکھا تھا۔ دوا جو چند دنوں سے انہیں بلوانے کے لیے خیالوں میں تبصرہ باندھ رہی تھیں۔ ایکا ایکی پژمردہ ہو گئیں۔

"چلو چھٹی ہوئی۔ اب دو ڈھائی مہینے اور جھگتنا ہے۔"

یہ سوچ کر وہ بے حد ملول اور دل گرفتہ ہو گئیں۔ اچانک اصفیہ کو خیال آیا کہ ثنا کے گھر میں ماموں جان سے جو موسیقی کا سبق لینا شروع کیا تھا۔ وہ ادھورا ہی رہ گیا۔ کہیں بھول نہ جائے۔ ماموں جان ایک اچھے موسیقار اور گلوکار تھے مگر شہرت سے دور ہی بھاگتے تھے۔ اپنی گھریلو محفلوں میں ان کی آواز اور دھنوں کی دھوم تھی۔ ایک روز اصفیہ سے وہ شرط ہار گئے۔ اور مجبوراً انہوں نے اپنی نٹ کھٹ بھانجی کو

حقیقت پسندی اور شدت احساس
کی شاعرہ اور افسانہ نگار
زیب النساء زیبی کا شعری مجموعہ
تیری یاد آتی ہے
شائع ہو گیا ہے
قیمت :- ۱۰۰ روپے
پتہ:۔ مکتبہ عمران ۳۷۰۔ اردو بازار، کراچی

اسی وقت اسے خیال آیا کہ موسیقی کی تعلیم ادھوری چھوڑنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اور کچھ تو وہ سیکھ ہی سکی۔ کم از کم ستار بجانا ہی سیکھ لے۔ اگر ابا اسے نانا کے گھر سے لے نہ آتے تو وہ خاصا بجانا سیکھ لیتی۔ گانے کا اسے بہت شوق تھا۔ نانا کے ہاں وہ خوب ماموں زاد بھائیوں کے ساتھ قوالی گاتی تھی۔ جسے نانا حلق پھاڑنے سے تشبیہ دیتے تھے۔

اس کے چاروں ماموں زاد بھائی جمال، کمال محبوب اور جمیل اس سے بہت بڑے تھے اور چاروں نے اسے اپنے اپنے کمالات کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ تو وہاں بہت خوش رہتی تھی پتا نہیں کیوں ابا جا کر اسے لے آئے۔ پھر اس کی اپنے ابا کے گھر بھی گندہ نہ ہوئی۔ تو یہاں پٹ گئے۔ شیر۔ یہ گھر اور یہاں کے لوگ بھی اچھے ہیں۔ گو کہ ویسے نہیں جیسے وہ چاہتی ہے۔ یہ اور قسم کے لوگ ہیں۔ پھر بھی اصفیہ خوش تھی۔ یہاں کمالات دکھانے کے مواقع زیادہ تھے۔ اور لوگوں کو حیران کرنے اور خوفزدہ کرنے میں اسے بہت لطف آتا تھا۔ رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اس نے کہا۔

"دڈا! پیاری دڈا! ہم نے ماموں جان سے موسیقی بھی سیکھی ہے۔ ہارمونیم، ستار اور سارے راگ راگنیاں، سارے گاما پادانی، سچ دڈا۔ ہم بہت اچھا گاتے ہیں ستار سنائیں آپ کو۔"

دڈا بے چاری منہ کھولے حواس باختہ سی اسے گھورے جا رہی تھیں۔

"بچ دڈا یہاں ایک کمرے میں ستار رکھا ہے۔ اس کمرے کی چابی ذرا دیکھئے۔ ہم شور نہیں کریں گے۔ ستار بھی خراب نہیں کریں گے۔ بس ذرا دیر کو بجایا کریں گے۔"

وہ خوشامد میں کرنے لگی۔ دڈا چپ۔ صبیحہ انہوں نے شاہین کو بلایا اور یوں گویا ہوئیں۔

"بیٹی! ایک نیا انکشاف۔ اصفیہ بی کو موسیقی سے بھی تعلق ہے۔ اب وہ ستار بجانا چاہتی ہیں۔ ستار تم نے۔ یہ گھر نہ ہوا بھڑ بھڑ ہو گیا کہ جہالت جہالت کے جانور وجود۔ لو بی! ایک فرزند کے شوق سے میں نالاں تھی۔ یہاں ایک دوسری قیامت تیار۔ میں کہتی ہوں لڑکی ہے کرتماشا، چھلاوا، بوا طبیعت اسی کو کہتے ہیں۔ جو نہ ہو وہ تھوڑا۔ اشفاق سنیں تو؟"

"یہی بات تو ہے اماں۔" شاہین ہنس کر بولیں۔ "بچی ہے تو سب کچھ کرنے دیں۔ ہمارے معظم کے سارے شوق اس میں ہیں۔ دل چاہتا ہے اسے کہیں جانے دیں۔"

"اوئی۔ ہوش میں تو ہو۔ دڈا نامراض ہونے لگیں۔" اس گھوڑی کی منگنی کو بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔ لاکھاں دولیت میں ڈکریوں پر ڈکریاں مجبور رہا ہے۔ لے جائے گا انہیں بھی۔ مگر مجھے تو ان کے طور طریقے گھر بسانے کے نظر نہیں آتے۔ یہ وہاں جا کر یہاں باپ کے نام کو خوب اچھالیں گی۔ لکھ لو۔"

"غلطی اشفاق بھائی کی ہے نا!" شاہین نے کہا۔ "اسے بچپن میں نانی کے ہاں چھوڑ آتے۔ وہ بوڑھی اور بیمار اس پر ان کے چار عدد پوتے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شریر، تیز طرار اور آفت۔ انہوں نے اپنے سارے گر اس پر آزمائے اور وہ بن گئی لڑکا نما۔ اب تو اس کی عادتیں پختہ ہو چکی ہیں۔ چلیے۔ اس کا یہ شوق بھی پورا کیجئے۔ آپ نے اسے درست کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ مگر لگتا ہے وہ آپ کو اپنے رنگ میں رنگ لے گی۔ کوئی عادت تو اس کی چھڑا نہ سکیں آپ۔ اور وہ ہے بھی بے قصور۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہے معظم کے ڈھب کی۔ آپ اشفاق بھائی سے ذکر تو کریں۔ یہ یقین ہے کہ اس گھر کے سوا اور کہیں اس کا گزارہ بھی نہیں ہو گا۔"

"اوئی بیری! منہ سے بھاپ بھی نہ نکالنا۔ لو اور سنو۔ میرے سفید جونڈے میں کالک لگوا دو گی کیا؟ جو کسی کے کان میں بھنک پڑ گئی تو ——— لکھ دیتی ہوں اشفاق کو۔ لے جائے اپنی بیٹی۔ چاہے نانی کے گھر رکھیں یا ماموں کے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اب تو اسکول میں داخلہ ہو چکا۔ نانی کے گھر تو اس نے پڑھ کر نہ دیا الف بے۔ ہڑبونگے پن میں وقت گذارا۔ لڑکی ذات کچھ تو پڑھ لے۔ اچھا خیر۔ میٹرک کرے تو ———"

دڈا نے مفاہمت کر لی تھی۔ ادھر اصفیہ کا اصرار، خوشامد اور تقاضے کہ وہ ستار بجانا چاہتی ہے۔ دڈا بے حد نیک اور کمزور دل کی مالک۔ وہ کسی کو بلاوجہ ڈانٹتی نہیں تھیں۔ کسی پر زبردستی بھی نہیں کرتی تھیں۔ ان کے پاس صرف ایک طاقت تھی۔ محبت شفقت کی طاقت۔ اسی کو مختلف طریقوں سے آزماتی رہتی تھیں۔ اصفیہ کے پُرزور اصرار پر وہ مجبور ہو گئیں۔ مگر انہوں نے اس کے بدلے میں کئی شرائط پیش کیں۔

کہ وہ پابندی سے ہوم ورک کرے گی۔ کمزور مضامین کے سبق جمیلہ اور بلقیس سے لے گی۔ اور ستار صرف رات کو بجائے گی۔ اگر کبھی کسی قسم کی شکایت اسکول سے یا گھر کے کسی فرد سے ملی تو اس کا ستار بجانا بند۔

اصفیہ نے تمام شرائط مان لیں۔ ہر نئے مشغلے یا

نئے کھیل کے شروع کرنے پر وہ پچھلی مصروفیات ترک کر دیتی تھی۔ اور کچھ دن بعد جب یہ نیا مشغلہ یا کھیل بھی پرانا ہو جاتا تو کسی نئے شغل کی تلاش میں رہتی۔ اب اس نے دعدے کو پورا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ زور شور سے پڑھائی شروع ہوئی۔ آنکھ مچولی بند۔ دیواروں پر کود پھاند بند۔ اب ستار کی دنوں دنوں میں ہی اس کی جان اٹکی رہتی۔ ستار دڈا نے پچھلے کمرے میں رکھوا دیا تھا۔ تاکہ اس کی آواز سے دوسرا کوئی ڈسٹرب نہ ہو۔ اور اس کمرے میں کھانے کے بعد دڈا کی اجازت ملتی۔ شروع میں رعب اور عزت نے دلچسپی لی تھی۔ پھر تو رفتہ رفتہ سبھی لڑکے لڑکیاں اس کے ستار اور گانے سننے کو جمع ہو جاتے۔ پھر ایک دن اس نے انکشاف کیا کہ وہ شفق اور ملیحہ کو بھی ستار بجانا سکھا رہی ہے۔ ان کے بعد باقی سب کو بھی۔ دڈا نے کہا۔

"ہیوئی پہلے تم تو سیکھ لو۔"

اصفیہ کے خیال میں وہ تو ستار بجانے میں ماہر تھی۔ اور اس کا مظاہرہ کرنے کی بھی ساعت آن پہنچی۔ بلقیس کی سہیلی سلومی کی چھوٹی بہن سالگی کی سالگرہ تھی۔ سلومی بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق لڑکی تھی۔ اس نے گھر کے سبھی لوگوں کو بلایا تھا۔ مگر اصفیہ کو سالگرہ کے ہنگامے سے دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی جب سلومی خود اسے لینے آئی تو وہ انکار نہ کر سکی۔ وہ ان کے گھر جا کر بور تو نہ ہوئی۔ جونہی معلوم ہوا کہ میوزک کا پروگرام بھی ہے۔ وہ خوش ہو گئی۔ اسٹیج پر سلومی کا بھائی بے ہنگم آرکسٹرا کے ساتھ اکھیل کود میں مصروف تھا۔ اور دوسرا بھائی ایک مشہور و مقبول گانے کا بیڑہ غرق کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ تبھی ملیحہ نے سلومی سے کہا۔

"اس سے اچھا تو اصفیہ آپا گا سکتی ہیں۔ انہیں ستار بجانا آتا ہے۔"

یہ بات سلومی نے اپنے بھائی کو بتا دی۔ اس دوران ہر طرف سے اصفیہ کو اسٹیج پر بلانے کی کوشش ہونے لگی۔ ہلڑ سا مچ رہا تھا۔

"ہو جائے مقابلہ۔" سلومی کے اس بھائی نے کہا، جس کے بال سیدھے اور چمکدار بھورے تھے۔ اور جو بلاوجہ اچھل کود کر رہا تھا۔

لڑکے لڑکیوں میں مقابلے کی بات سب نے مان لی۔ اصفیہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے اس مجمع میں گانے سے صاف انکار کر دیا۔ البتہ بہت خوشامد کے بعد ستار بجانے کی حامی بھر لی۔ جانے کہاں سے ایک بوسیدہ ستار مہیا کیا گیا۔ اور سلومی کے دوسرے بھائی نے طبلے پر ہاتھ مارا۔ اصفیہ بہت سنجیدگی کے ساتھ اسٹیج پر آئی۔ بے حد مشتاق نظروں کے حصار میں اسے ستار چھیڑنا دوبھر ہو گیا۔ مگر لڑکوں کے فلک شگاف حملے اور تضحیک سے بھری نظروں نے جوش دلایا تو حوصلے اور ہمت کے ساتھ اس نے تار کو چھیڑا۔

"اس کے تار ڈھیلے ہیں۔" اس نے اعتراض کیا۔

"ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔" کسی نے جملہ کسا۔

اب اصفیہ کو غصہ اور جوش آ گیا۔ ستار کے تار اصفیہ کی انگلیوں کے پابند ہو گئے تھے۔ طبلے نے بھی خوب ساتھ دیا اور سارے مجمع نے تالیاں بجائیں۔

جب وہ گھر واپس آنے کے لیے گیٹ سے نکلیں۔ طبلے والا سلومی کا بھائی اصفیہ کا پکا دوست بن چکا تھا۔ وہ جس کے بالوں میں ہلکی ہلکی لہریں اور ہلکا سنہرا پن تھا۔ اور جس کی آنکھیں ہر دم ہنستی رہتی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی اصفیہ کا مذاق نہیں اڑایا۔ دوسرا بھائی جس کے بال سیدھے اور بھورے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اصفیہ کے لیے طنز اور تضحیک کے جذبات تھے۔ اصفیہ کو وہ بہت برا لگا۔ مگر گھر آ کر اچانک اسے اپنی اس حرکت پر افسوس ہوا۔ جب دڈا نے امین اور عزت سے اصفیہ کے ستار بجانے اور وہاں سب کی واہ واہ کے پُرجوش قصے سنے۔ اور وہ محض صدمے کے زیر اثر چپ چاپ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ انہوں نے اصفیہ سے بھی کچھ نہ کہا۔ اور کئی دن تک سوچ میں ڈوبی رہیں۔

اصفیہ پہلے دن کی شرمندگی کے بعد دڈا کی خاموشی کو منظوری سمجھ کر خاموش رہی۔ اس نے معافی نہیں مانگی۔ اس کے رات دن اسی طرح گذرتے رہے۔ ایک روز جب وہ اسکول سے آئی تو جمیل بھائی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ خوش بھی ہوئی۔ کتنے دن کے بعد اس نے جمیل بھائی کو دیکھا تھا۔ بستہ میز پر رکھ کر خوشی کی ایک تیز چیخ مار کر ایک دھپ ان کے بازو پر رسید کر کے چلا اٹھی۔

"ارے جمیل بھائی۔ آپ اف اللہ میں کتنا یاد کرتی تھی آپ سب کو۔ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟"

"تم کو لینے آیا ہوں۔" جمیل نے بتایا۔ "تمہارے ابا امی حج کر کے آ گئے ہیں۔ اور تمہاری امی یعنی میری پھپھو بیمار ہو گئی تھیں۔ اس لیے یہاں نہ آ سکیں۔ اب انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ جلدی تیاری کرو۔ پھپھو نے کہا ہے وہاں تمہارا داخلہ بھی ہو جائے گا۔ اگر تم پڑھنا چاہو گی۔"

اصغیہ نے حیرت سے دادا کو دیکھا۔ انہوں نے مدد دوسری طرف کر لیا اور بولے "پڑھنے والوں کے لیے کسی خاص جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور یہ وہاں بھی پڑھ لے گی۔ جو کچھ سکھایا جائے گا سیکھ لے گی۔ ہوشیار ہے۔ کوئی بڑھ کو نہیں؟"

اصغیہ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اگر وہ پڑھ سکتی تھی تو بھی نانی بھی دادی کے پاس کیوں بھیجی جاتی۔

اس نے دادا کے ہاتھ پر دبائے پلنگ پر بیٹھ کر بازو سہلاتے ہوئے پوچھا۔ بار بار پوچھتی رہی کہ اسے کیوں بھیجا جا رہا ہے اس نے کیا غلطی کی تھی۔ دادا کے پاس ایک جواب تھا۔

"بیوی! تمہاری ماں باپ نے بلایا ہے۔ میں روکنے والی کون؟" اصغیہ علیم چچا کے ہاں دوڑی گئی۔ علیم چچا اور اس کی بیوی بچے آئے۔ دادا نے اس کی سفارش کی گئی۔ اس دوران دادا اس کے کپڑے بغل میں رکھ چکی تھیں۔ اس کا بستر ایک ڈوری سے باندھا جا چکا تھا۔ اور اشرفی نے راستے کے لیے کھانا پکا کر لنچ رنگ کے رومال میں باندھ کر بغل میں رکھ دیا تھا۔ بہت سی صافی تلافی اور سینکڑوں ہدایتوں کے بعد دادا بھیج گئیں۔ اشفیہ کے لیے دلگایا جانے والا تانگہ واپس کیا گیا۔ اور بندھا ہوا بستر کھلا۔ اول رومال کھول کر اسی وقت اس نے جمیل بھائی کے ساتھ بیٹھ کر سارا کھانا کھا لیا۔ وہ اچھی نیک سعادت مند بچی تھی کی ساری ہڈیاں ماں چکی تھی۔ نیز اسی ڈر سے کہ گھر جا کر شاید بھانا یا کھانا کھانا اس کے لیے دشوار ہو گئے۔ اس نے بھوک مٹا لی۔ دادا کی غربت، ان کا بے فراغ گھر۔ جہاں کھاتے اچھے لوگ۔ اور پڑوس کی لڑکی سلمیٰ کے وہ دو بھائی جن میں سے ایک درست دوسرا دشمن پھر یہ سرسبز لان اور پھلوں کے درخت، پھولوں کے پودے وہ چاہے کر لے بس دادا کو خبر نہ ہو تو مزا آ جائے۔ اس گھر اس ماحول سے دور بنا اب اس کے لیے قابل قبول نہ تھا جہاں کوئی تھیں اور مرد تھیں۔

ہر روز جوری سے جانے میں دیر ہو جائے۔ اسکول میں پڑھائی، گھر پر مغز سوزی کر کے ہوم ورک جمیلہ سے انگلش اور مقیس سے حساب پڑھنا، شاد کا بھی اب گرڈ سے دار ہو گیا۔ لیکن دیواروں پر چھپکلی قدمی، مچھروں پر رقص بھرے شروع ہو گیا۔ آنکھ مچولی بھی ہونے لگی اور لڑکوں کے ساتھ کشتی داؤ پیچ مگر سب کچھ دادا کی نظر سے اوجھل ہو کر ہوتا۔ یہ بات اب سب کی سمجھ میں آ گئی تھی اصغیہ کی حرکتیں، شرارتیں اور

لڑکے والے کھیلوں کی دنیا کو چھوڑ ہوئی تو وہ واپس بھیج دی جائے گی۔ اور یہ بات کسی کو منظور نہ تھی۔

امتحان کا زمانہ قریب تھا۔ اور پھر کھیل قریب تھی۔ لان میں ہی کیاریوں میں۔ بلنگ کے پھول توڑنے۔ بازو کے ساتھ سوئیٹ پی کے کاسنی گلابی اور سفید پھول ٹانکنے کے ساتھ مہک رکھنے۔ بڑے پلنگ کے پائے سے میں گلوں میں گلاب سجے گئے۔ دادا کے صحن میں بھی بہار کے پاس اور چبوترے کے نیچے کیاریاں بنی تھیں۔ جن میں موسم کے پھول ہر سال لگا لیے جاتے۔ مگر اس سال وہ سارے پھولوں کے [illegible] گلہ پھولوں کی قدر ہو چکی تھی۔ جن چند سدا بہار جنس کے پودے تھے۔ دادا اپنی آجڑی کیاری کو دیکھ کر خفگی کی ماس جھڑکیں۔

"ہم انگلش میں بہت ہی کمزور ہیں۔ اور حساب میں تو بیچارہ صفر۔ مس کہتی ہیں اس سال استان میں بیٹھنا فضول ہے۔" ایک دن اس نے بستر پر لیٹے لیٹے کاپی پر دادا کی شکل کا خاکہ اتار کر دادا کو دکھایا۔

"کیسے فضول ہے۔" دادا نے سختی سے کہا۔ "امتحان میں بیٹھنا ہے اور پاس ہونا ہے اگر ایک پرچے میں بھی فیل ہو گئی۔ میں تمہیں تمہارے باپ کے پاس بھیج دوں گی۔ سنا تم نے۔ اگر میں ہوں تو کالج میں داخلہ کرا دوں گی۔ تم کو شرم نہیں آتی شفق اور بلقیس سے کتنی بڑی ہو اور ان کے ساتھ کلاس میں ہو۔ تمہیں جمیلہ نہیں ٹوشاد کی ہم جماعت ہونا چاہیے تھا۔ تم ہر چیز میں پھسڈی ہو۔"

"جو نہیں آتا ہے۔ وہ نہیں نہیں آتا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "اس طرح برابر ہیں ہم۔ اس کے علاوہ ہماری مشکل ہو چکی ہے۔ جمیلہ آپا بلقیس آپا کی ہم سے پہلے ہونی چاہیئے تھی۔ وہ ہمارے ہر معاملے میں پھسڈی ہیں کہ نہیں۔ اس کا ذکر آپ کبھی نہیں کرتیں۔"

دادا ناک پر انگلی ناک پر رکھ کر اسے دیکھتی رہیں۔ پھر ہلا ہلا کر سیب کھاری تھی۔

"اچھا پیر پست بلا ڈالا ہوں نے فرشگی سے کہا اور کوئی جواب انہیں سوجھا نہیں۔

"امتحان ہو لیں۔ تو تم جا کر اپنے باپ سے مل آنا۔ ایک دن دادا نے اسے پڑھائی میں عرق دیکھ کر سوچتے سے کہا۔

"نہیں۔ ہمیں کہیں نہیں جانا۔" اس نے پورے یقین اور اطمینان سے کہا۔

"کیا تمہیں اپنے گھر والے یاد نہیں آتے؟" اصغیہ کو سر ہلا کر انکار کرتے دیکھ کر وہ اور بھی ششدر رہ گئیں۔ "کیسی بیٹی ہے جو ماں کو بھول گئی۔ میں کہتی ہوں بیٹی تو کس

وہ جو ہمیں ماں محبوبی ہیں جو ہمیں نہیں۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔ دادا اور بھی حیران ہوئیں۔

"کس نے کہا کہ وہ تمہاری ماں نہیں ہیں؟"

"انہوں نے خود۔" دادا پر ان سے بولی۔ "کل ماں ہوتیں تو کبھی آ کر مجھے لے جاتیں یا جاتیں۔ نانا کے گھر ہوں یہ ہوتے ہیں جب ابا کبھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تو دو دن بعد ہی کہنے لگتی ہیں۔ وہ نظر نہ آنے سے ہوں۔ تمہیں بھی کہیں دل کر دیکھ لیتے ہوں۔"

دادا کو اس کے منہ سے ایسی بات سننے کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے سر پھیر کر کہا۔ "جب ہی تو ہم نے تمہیں ان کے پاس نہیں بھیجا۔ تم تو ہمیں ہی اپنی ماں سمجھو۔"

"ہوں۔" اصغیہ نے کندھے جھٹک دیے۔ "ماں کو تو ہونا چاہیئے کہ وہ ہر حال سے بچا کر اپنے پاس رکھے۔ ایسی ہو کہ کبھی ہم نہیں کر سکتے کہ انہیں اسٹیشن پر چھوڑ کر چلے جائیں۔ ہمارا پیر کٹ جائے تو بھی کہ اس کی کمی آنے دیں۔ اگر دو بار بھولے سے ہاتھ سے نکل جائے تو ہم ٹریفک بند ہو جائے گا۔ دادا! کتنے دن ہو گئے آپ کو اسٹیشن ہوا ہے دیکھے ہوئے۔ چلیں آج ہی۔"

دادا نے مسکراہٹ روکی۔ "اب تو سوچتے ہی ہیں۔ ہم تو کبھی نہیں جائیں گے۔ تم لوگ تو ہر وقت ہی ہو۔ ہم تو کبھی کبھی جاتے ہیں۔ کھانا تو اچھا کیا اپنے باپ کا؟"

دادا نے تھوڑی کے بال میں الجھنے کے لیے زبان سے چپ ہونا کہ کوئی جواب نہ دیتیں تو وہ کامیاب کر دیتی۔ اور اشفیہ۔ "ہم کوئی جواب نہیں دیں گی کوئی کام۔"

باپ کھاتے تو خوب رہ ہوں گے کہ ان کے پاس جانے کی ضد کرتی۔ جہاں اس کے خوب ناز اٹھائے جاتے۔ اس گھر میں کوئی کمی نہ ہونے سے اصل نانی اور چاروں ماموں کے اس کو بہت چاہنے اور اسی بے آسرا ہونے اس کے اسکول نہ جانے کے لیے کسی اسکول کی استانیاں اصغیہ کو پسند نہ تھیں۔ جن پر اشفاق اب اسے اپنی جہاں کے بل بوتے پر چھوڑنے چلے تھے اس کو دل ہی دل میں لگا رہا تھا۔ نانی کے گھر میں، تو نانا جس خاندان میں اعزاز کی چھت تھی۔ جہاں خوب دولت ہوتا۔ اور جانوروں کے ساتھ کبوتر بازی اور پتنگ بازی کے علاوہ دوڑ ایک بہت بڑی چھت پر جھولتیں اور دیواروں سے جھیل کر اترنے

اصغیہ نے حیرت سے دادا کو دیکھا۔ انہوں نے مدد دوسری طرف کر لیا اور بولے "پڑھنے والوں کے لیے کسی خاص جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور یہ وہاں بھی پڑھ لے گی۔ جو کچھ سکھایا جائے گا سیکھ لے گی۔ ہوشیار ہے۔ کوئی بڑھ کو نہیں؟"

اصغیہ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اگر وہ پڑھ سکتی تھی تو بھی نانی بھی دادی کے پاس کیوں بھیجی جاتی۔

اس نے دادا کے ہاتھ پر دبائے پلنگ پر بیٹھ کر بازو سہلاتے ہوئے پوچھا۔ بار بار پوچھتی رہی کہ اسے کیوں بھیجا جا رہا ہے اس نے کیا غلطی کی تھی۔ دادا کے پاس ایک جواب تھا۔

"بیوی! تمہاری ماں باپ نے بلایا ہے۔ میں روکنے والی کون؟" اصغیہ علیم چچا کے ہاں دوڑی گئی۔ علیم چچا اور اس کی بیوی بچے آئے۔ دادا نے اس کی سفارش کی گئی۔ اس دوران دادا اس کے کپڑے بغل میں رکھ چکی تھیں۔ اس کا بستر ایک ڈوری سے باندھا جا چکا تھا۔ اور اشرفی نے راستے کے لیے کھانا پکا کر لنچ رنگ کے رومال میں باندھ کر بغل میں رکھ دیا تھا۔ بہت سی صافی تلافی اور سینکڑوں ہدایتوں کے بعد دادا بھیج گئیں۔ اشفیہ کے لیے دلگایا جانے والا تانگہ واپس کیا گیا۔ اور بندھا ہوا بستر کھلا۔ اول رومال کھول کر اسی وقت اس نے جمیل بھائی کے ساتھ بیٹھ کر سارا کھانا کھا لیا۔ وہ اچھی نیک سعادت مند بچی تھی کی ساری ہڈیاں ماں چکی تھی۔ نیز اسی ڈر سے کہ گھر جا کر شاید بھانا یا کھانا کھانا اس کے لیے دشوار ہو گئے۔ اس نے بھوک مٹا لی۔ دادا کی غربت، ان کا بے فراغ گھر۔ جہاں کھاتے اچھے لوگ۔ اور پڑوس کی لڑکی سلمیٰ کے وہ دو بھائی جن میں سے ایک درست دوسرا دشمن پھر یہ سرسبز لان اور پھلوں کے درخت، پھولوں کے پودے وہ چاہے کر لے بس دادا کو خبر نہ ہو تو مزا آ جائے۔ اس گھر اس ماحول سے دور بنا اب اس کے لیے قابل قبول نہ تھا جہاں کوئی تھیں اور مرد تھیں۔

ہر روز جوری سے جانے میں دیر ہو جائے۔ اسکول میں پڑھائی، گھر پر مغز سوزی کر کے ہوم ورک جمیلہ سے انگلش اور مقیس سے حساب پڑھنا، شاد کا بھی اب گرڈ سے دار ہو گیا۔ لیکن دیواروں پر چھپکلی قدمی، مچھروں پر رقص بھرے شروع ہو گیا۔ آنکھ مچولی بھی ہونے لگی اور لڑکوں کے ساتھ کشتی داؤ پیچ مگر سب کچھ دادا کی نظر سے اوجھل ہو کر ہوتا۔ یہ بات اب سب کی سمجھ میں آ گئی تھی اصغیہ کی حرکتیں، شرارتیں اور

لڑکے والے کھیلوں کی دنیا کو چھوڑ ہوئی تو وہ واپس بھیج دی جائے گی۔ اور یہ بات کسی کو منظور نہ تھی۔

امتحان کا زمانہ قریب تھا۔ اور پھر کھیل قریب تھی۔ لان میں ہی کیاریوں میں۔ بلنگ کے پھول توڑنے۔ بازو کے ساتھ سوئیٹ پی کے کاسنی گلابی اور سفید پھول ٹانکنے کے ساتھ مہک رکھنے۔ بڑے پلنگ کے پائے سے میں گلوں میں گلاب سجے گئے۔ دادا کے صحن میں بھی بہار کے پاس اور چبوترے کے نیچے کیاریاں بنی تھیں۔ جن میں موسم کے پھول ہر سال لگا لیے جاتے۔ مگر اس سال وہ سارے پھولوں کے [illegible] گلہ پھولوں کی قدر ہو چکی تھی۔ جن چند سدا بہار جنس کے پودے تھے۔ دادا اپنی آجڑی کیاری کو دیکھ کر خفگی کی ماس جھڑکیں۔

"ہم انگلش میں بہت ہی کمزور ہیں۔ اور حساب میں تو بیچارہ صفر۔ مس کہتی ہیں اس سال استان میں بیٹھنا فضول ہے۔" ایک دن اس نے بستر پر لیٹے لیٹے کاپی پر دادا کی شکل کا خاکہ اتار کر دادا کو دکھایا۔

"کیسے فضول ہے۔" دادا نے سختی سے کہا۔ "امتحان میں بیٹھنا ہے اور پاس ہونا ہے اگر ایک پرچے میں بھی فیل ہو گئی۔ میں تمہیں تمہارے باپ کے پاس بھیج دوں گی۔ سنا تم نے۔ اگر میں ہوں تو کالج میں داخلہ کرا دوں گی۔ تم کو شرم نہیں آتی شفق اور بلقیس سے کتنی بڑی ہو اور ان کے ساتھ کلاس میں ہو۔ تمہیں جمیلہ نہیں ٹوشاد کی ہم جماعت ہونا چاہیے تھا۔ تم ہر چیز میں پھسڈی ہو۔"

"جو نہیں آتا ہے۔ وہ نہیں نہیں آتا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "اس طرح برابر ہیں ہم۔ اس کے علاوہ ہماری مشکل ہو چکی ہے۔ جمیلہ آپا بلقیس آپا کی ہم سے پہلے ہونی چاہیئے تھی۔ وہ ہمارے ہر معاملے میں پھسڈی ہیں کہ نہیں۔ اس کا ذکر آپ کبھی نہیں کرتیں۔"

دادا ناک پر انگلی ناک پر رکھ کر اسے دیکھتی رہیں۔ پھر ہلا ہلا کر سیب کھاری تھی۔

"اچھا پیر پست بلا ڈالا ہوں نے فرشگی سے کہا اور کوئی جواب انہیں سوجھا نہیں۔

"امتحان ہو لیں۔ تو تم جا کر اپنے باپ سے مل آنا۔ ایک دن دادا نے اسے پڑھائی میں عرق دیکھ کر سوچتے سے کہا۔

"نہیں۔ ہمیں کہیں نہیں جانا۔" اس نے پورے یقین اور اطمینان سے کہا۔

"کیا تمہیں اپنے گھر والے یاد نہیں آتے؟" اصغیہ کو سر ہلا کر انکار کرتے دیکھ کر وہ اور بھی ششدر رہ گئیں۔ "کیسی بیٹی ہے جو ماں کو بھول گئی۔ میں کہتی ہوں بیٹی تو کس

وہ جو ہمیں ماں محبوبی ہیں جو ہمیں نہیں۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔ دادا اور بھی حیران ہوئیں۔

"کس نے کہا کہ وہ تمہاری ماں نہیں ہیں؟"

"انہوں نے خود۔" دادا پر ان سے بولی۔ "کل ماں ہوتیں تو کبھی آ کر مجھے لے جاتیں یا جاتیں۔ نانا کے گھر ہوں یہ ہوتے ہیں جب ابا کبھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تو دو دن بعد ہی کہنے لگتی ہیں۔ وہ نظر نہ آنے سے ہوں۔ تمہیں بھی کہیں دل کر دیکھ لیتے ہوں۔"

دادا کو اس کے منہ سے ایسی بات سننے کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے سر پھیر کر کہا۔ "جب ہی تو ہم نے تمہیں ان کے پاس نہیں بھیجا۔ تم تو ہمیں ہی اپنی ماں سمجھو۔"

"ہوں۔" اصغیہ نے کندھے جھٹک دیے۔ "ماں کو تو ہونا چاہیئے کہ وہ ہر حال سے بچا کر اپنے پاس رکھے۔ ایسی ہو کہ کبھی ہم نہیں کر سکتے کہ انہیں اسٹیشن پر چھوڑ کر چلے جائیں۔ ہمارا پیر کٹ جائے تو بھی کہ اس کی کمی آنے دیں۔ اگر دو بار بھولے سے ہاتھ سے نکل جائے تو ہم ٹریفک بند ہو جائے گا۔ دادا! کتنے دن ہو گئے آپ کو اسٹیشن ہوا ہے دیکھے ہوئے۔ چلیں آج ہی۔"

دادا نے مسکراہٹ روکی۔ "اب تو سوچتے ہی ہیں۔ ہم تو کبھی نہیں جائیں گے۔ تم لوگ تو ہر وقت ہی ہو۔ ہم تو کبھی کبھی جاتے ہیں۔ کھانا تو اچھا کیا اپنے باپ کا؟"

دادا نے تھوڑی کے بال میں الجھنے کے لیے زبان سے چپ ہونا کہ کوئی جواب نہ دیتیں تو وہ کامیاب کر دیتی۔ اور اشفیہ۔ "ہم کوئی جواب نہیں دیں گی کوئی کام۔"

باپ کھاتے تو خوب رہ ہوں گے کہ ان کے پاس جانے کی ضد کرتی۔ جہاں اس کے خوب ناز اٹھائے جاتے۔ اس گھر میں کوئی کمی نہ ہونے سے اصل نانی اور چاروں ماموں کے اس کو بہت چاہنے اور اسی بے آسرا ہونے اس کے اسکول نہ جانے کے لیے کسی اسکول کی استانیاں اصغیہ کو پسند نہ تھیں۔ جن پر اشفاق اب اسے اپنی جہاں کے بل بوتے پر چھوڑنے چلے تھے اس کو دل ہی دل میں لگا رہا تھا۔ نانی کے گھر میں، تو نانا جس خاندان میں اعزاز کی چھت تھی۔ جہاں خوب دولت ہوتا۔ اور جانوروں کے ساتھ کبوتر بازی اور پتنگ بازی کے علاوہ دوڑ ایک بہت بڑی چھت پر جھولتیں اور دیواروں سے جھیل کر اترنے

میں کمال حاصل کر لیا تھا۔

وہاں یہ تھا کہ اسے چاروں بھائیوں کے ماتحت رہنا پڑتا تھا۔ یہاں سب اس کے شاگرد بن گئے۔ لاکھ یہاں بڑی ہونے کے باوجود اس کے رعب میں رہتیں۔ اور پھر کلیم بھی کیا مزیدار باتیں کرتیں۔ اور اس کی ہر قسم کی بکواس پر ہنستی ہنستی لوٹ پوٹ جاتیں۔ ادھر اشرفی جوا کی آل اولاد دیکھ پر وہ مستقل حکومت کرتی۔ دھونس جماتی اور من مانی کرتی۔ اور جہاں جہاں اسے غلط ہوں وہاں اگر دڈا کو خوش کرنے کے لیے خود اٹھ لیا جاتا تو کیا حرج ہے۔ اور اس کے پڑھنے کے بعد دڈا جو خوب مٹھائی اور پھل اسے کھلاتیں۔ زندگی کا اصل مزا تو اب آیا تھا۔ اس گھر سے کہیں جانے کا اس کا قطعاً کوئی پروگرام نہ تھا چاہے ابا کتنا ہی کہیں نہ جائیں۔

ایک روز شبے چاصفی اللہ سے ملنے کوئی صاحب آئے۔ ان کی موٹر سائیکل پورچ میں کھڑی تھی۔ اتفاق سے اصفیہ ادھر آئی۔ اسی میں وہ خوبانی کے پیڑ کو دیکھنے آئی تھی جس میں پندرہ بیس دن سے کھیاں آ رہی تھیں اور پھول ابھی تک نہیں کھلا تھا۔ بڑے چچا نے کہا تھا کہ یہ پیڑ بہت کمزور ہے اس لیے پہلی بہار ہوگی اس کو ضائع کر دیں گی۔ اور پھر پھول کھلنے کے بعد توڑ دیے جائیں گے تاکہ پہلی بار پھل دگنے اور اگلے سال زیادہ مضبوط، زیادہ پھول پھل آئیں ــــ لیکن خوبانی کے پیڑ سے پہلے اس کی نظر پورچ میں کھڑی موٹر سائیکل پر پڑی۔ سبز میں چھایاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ مارے خوشی کے اس کی سانس رکنے لگی اور وہ بلا جھجک اس پر اچک کر جا بیٹھی۔ اس گیٹ سے اس گیٹ تک اس نے کئی چکر لگا لیے تو تمام لڑکے اور لڑکیوں کو خبر ہو گئی تھی۔ دڈا کو خبر ہونے تک وہ سب کو باری باری گیٹ کے باہر سڑک تک کی سیر کرا چکی تھی۔ برآمدے میں بیٹھ کر کے شوفیروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ اب میری باری ہے اصفیہ ابھی ایک دفعہ اور۔"

"اچھی اصفیہ ابھی ایک دفعہ اور۔ میں تمہیں سارے چکر پورے دوں گی۔"

"میں تمہیں چوٹ پٹے پتنے لا کر دوں گا بالکل مفت۔"

"میرے سب بٹے لے لینا تم۔"

"اور میں تو تمہیں ہوم ورک کرا دوں گی۔" شفق نہایت لجاجت سے کہہ رہی تھی۔ یہاں تک کہ بے حد سنجیدہ اور غصے سے اڑا کی مٹا اور ثابی مارے خوشی کے کھلی پڑ رہی تھیں۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ اور آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ جب دڈا برآمدے تک پہنچیں۔ اصفیہ بیچ اور عرفہ کو ایک ساتھ بٹھا کر لا رہی تھی۔ اور اب وہ سیٹ سے اتر رہے تھے۔ دڈا کو دیکھتے ہی سارے [illegible]

بے چاری اصفیہ اور دڈا کی تیز غضبناک نظریں۔

بڑے چچا نے سامنے بچوں سے روداد سن کر لمبا قہقہہ لگایا اور سب کے زور زور سے دڈا سے سفارش کرنے پر۔ بے چاری اصفیہ کی۔ ابھی دڈا نے گھور کر اسے سامنے بٹھا کر محض گھورنا ہی شروع کیا تھا۔ کیا مزا دیں۔ وہ سوچ ہی رہی تھیں۔ کہ صفی اللہ ہنستے مسکراتے اندر چلے آئے۔

"ابے واہ ابی! یہ لڑکی تو کمال کی ہے۔ اس کی ڈرائیونگ نوٹ فائل ہو گیا۔ بس یہ میٹرک پاس کر لے تو میں فوج میں اپنی کر دوں۔ یہ وہیں خوب رہے گی۔ اس کی قدر فوج میں ہی ہوگی۔ بھلی لیتی کر دڈی کیا ہے شیر نی ہے۔ واللہ۔"

"اے واہ! یہ دڈا کے تو پتلے لگ گئے۔ تم کون کر خواہ مخواہ۔ لوا در شہو۔ اس کے باپ زندہ موجود۔ وہ جو چاہیں کریں۔ فوج میں بھیجیں کہ پولیس میں۔ بس میٹرک کر لے تو روانہ کر دوں اسے نا بابا! پرائی لڑکی کی ذمہ داری بہت کٹھن ہے۔ جو اس کی دلیری سے ہے یا اور کسی کو نقصان پہنچ جائے تو میں کس کس کا منہ بند کروں گی۔ میں ہرگز نہ۔"

"ماں ابی!" بڑے چچا نے پھر کہا۔ "ایسی لڑکی پر تو لڑکے نثار کیے جا سکتے ہیں۔ کاش! میری کوئی ایسی لڑکی ہوتی۔ یہ جرأت یہ تہور۔ اس قدر اعتماد۔ واہ ہی روشن مستقبل اس کے انتظار میں ہے۔"

بچا واقعی بہت متاثر تھے۔ اسی اثنا میں کلیم چچا بھی آ گئے۔ انہوں نے بھی تائید کی اور کہا کہ یار کی تو کبھی بھی کسی کے لیے مشکل نہیں بنتی۔ بلکہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ دوسروں کے مسائل حل کر سکتی ہے۔ گھر میں کوئی مرد نہ ہو تو ایسا ہی اصفیہ موجود ہے۔ اگر ایک موٹر سائیکل ہو تو چھوٹی بچیاں سارے کام ہو سکتے ہیں۔ کسی کو شاپنگ کے لیے۔ کسی کو ڈاکٹر کے یا کسی سے ملنے جانے کے لیے بھی ٹیکسی کا بھی انتظار نہیں۔ اصفیہ جو ہے سب کچھ کر سکتی ہے۔"

دڈا مارے انسو کے کچھ بول بھی نہ سکیں۔ بچوں جیسی باتیں۔ ایک نوجوان، تجربے کار لڑکی موٹر سائیکل جیسی خطرناک سواری پر لوگوں کو بٹھائے بازاروں میں پھرے۔ ڈاکٹر کے ماں باپ بھائی کہاں کہاں۔ اور جو کہیں اس کے ماں باپ کو ہتک ہو گئی۔ کیا ہوگیں۔ اس لیے یہاں انہوں نے اپنی بچی کو چھوڑا ہوا ہے۔ کہ وہ سارے گھر کے مسائل حل کرے۔ پڑھنے میں پیسے ہی کو نسا دل ہے کہ اب اسے شوق چرایا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے اچھا کر رہی ہے۔ ایسے ایسے عقل سکھانے اس میں اعتماد پیدا کرنے کے بجائے یہ لوگ اس کی ذرا سی کمی کو بھی مٹائے دے رہے ہیں۔

وہ سوچتی اور کڑھتی رہیں۔ اصفیہ کو ڈانٹے، اسے سزا دینے اور سمجھانے کا وقت ہی نہیں ملا۔ انہوں نے اسکول کی ایک ٹیچر کو ملازمت کر لیا۔ وہ اسکول کے بعد بچیوں کو پڑھا دیا کریں گی۔ امتحان بالکل قریب آ گئے۔ اور جب اسے پہلا پیپر دینے جانا تھا۔ وہ بے حد خوفزدہ تھی۔ دڈا نے اسے خوب دعائیں دیں اور خود بھی چھوڑ کر آنے تک دعا کرتی رہیں۔

"الٰہی! میری محنت پار لگانا۔"

امتحان کے بعد سیکڑوں تیرتوں لڑکیاں ٹیچر کے پاس اگلے چکر کی تیاری کے لیے جاتیں۔ وہاں سے آ کر اصفیہ تو پٹ پڑ کر بھوک بھوک کے نعرے لگاتی کچن میں جا گھستی۔ دڈا کو بہت رحم آتا۔ پھر شام کو کلیم چچا کے ایک مٹھے والے آجاتے اور بنی کے ہاں کھلی چھت پر وہ لڑکیوں کو پڑھاتے۔ وہ تھکتے ہی نہیں تھے۔ بس انہیں ہر پندرہ منٹ کے بعد چائے کی پیالی مل جائے۔ وہ بروریں اکر پڑھاتے جاتے۔ شفق کا خیال تھا چچا نے ان کے پے پیٹرول کا کام رکھا ہے۔ کلیم چچا نے چائے کی ترسیل کا ذمہ لیا ہوا تھا۔ جونہی اسٹر صاحب حنا شفق کی طرف متوجہ ہوتے وہ اچک کر آتش دان کی چمنی پر چڑھ جاتی۔ یہ آتش دان بیٹھے بیٹھے چچا کے کمرے کا تھا۔ نیچے کمرے میں ہونے والی گفتگو بھی اسے سنائی دے جاتی۔

کبھی کبھار وہ منجھلے چچا کی غصے بھری آواز بھی سنتی۔ وہ زور سے چلاتے چیختے۔ اور بیوی کو ڈانٹتے۔ کبھی کبھی شنا اور حنا بھی ان کے غصے کی زد میں آ جاتیں۔ اب اصفیہ کو اندازہ ہوا۔ منجھلی چچی اتنی چپ چپ کیوں رہتی ہیں۔ اور بچیاں بھی سہمائی ہوئی۔ وہ اپنے باپ سے نہایت خوفزدہ رہتی تھیں اور سب سے الگ تھلگ رہنے کی بھی یہی وجہ تھی کہ منجھلے چچا کے غصے سے ڈرتی تھیں۔

بڑے چچا اور کلیم چچا کتنے مہربان اور شفیق تھے۔ یہ منجھلے چچا ایسے کیوں ہیں۔ اتنے عرصے میں انہوں نے اصفیہ سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ جب کبھی بڑے چچا تو اس کی تعریف کرتے نہ تھکتے۔ جب کبھی رات میں دڈا کے گھر سب لوگ کھانا کھاتے وہ اور کلیم چچا اصفیہ کو خوب ہتت دلاتے۔ اس کی شرارتوں کو سراہتے۔ ہاں کبھی کبھی کسی غیر ضروری حرکت سے منع بھی کر دیتے۔ مگر یہ جو منجھلے چچا ہیں نا۔ نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ وہ کسی سے بھی مخاطب نہ ہوتے۔ بس کھانا کھا کر رفو چکر ہو جاتے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور بیٹیاں بھی تیز تیز چلتی ہوئی اپنے کمروں کی جانب اندھیرے میں گم ہو جاتیں۔

اس دن بھی چھتی کے اندر سے منجھلے چچا کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جانے کس پر خفا ہو رہے تھے۔

اس نے دعا کو خلب کر کے کہا "جانے دو۔ اشو تو دیکھو پیچھے کتنا سے تمہارے تایا جان کے چلانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔"

دعا کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ رو دینے کو ہو گئی۔ اور عشرت کے پکارنے کی بھی پروا کیے بغیر کتابیں اٹھا کر بھاگ گئی۔ نیچے پہنچ کے قدموں کی چاپ دیر تک سنائی دیتی رہی۔ بعد میں بہت بوچھنے پر بھی اس نے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکالا۔ رات کو اصفیہ نے دڈا سے سارا ماجرا کہہ سنایا اور پوچھ لیا۔

"دڈا! یہ منجھلے چچا ایسے کیوں ہیں؟"

دڈا ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گئیں۔ دور کہیں نظریں جما کر سوچنے لگیں پھر چپکے سے بولیں۔

"پتہ نہیں کہاں پر اٹکی ہوئی ہے۔"

اصفیہ کے بہت پوچھنے پر انہوں نے اسے آہستہ آہستہ بتایا۔ "صفی اللہ کی ماں بہت پیارا مورچہ گئیں۔ کلیم تو بہت ہی چھوٹا سا تھا صفی اللہ کچھ ارتھے۔ ماں کی کمی کو سب سے زیادہ معین نے محسوس کیا۔ وہ شروع سے ہی ضدی ہو گیا۔ ہر وقت ماں کے لیے ضد کرتا۔ ان کے آنے تک اسی کی ضد سے مجبور ہو کر مجھلے چچا کی۔ اور مجھلے چچی دن ہی دن دہرا دیا کہ میں ان کو ان کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہوں گی۔ انہیں ماں کی چھاؤں دوں گی۔ بالکل سگی ماں کی طرح۔ میں بھی ان دنوں اور اور کو جھتی۔ اس ذمے داری اور وعدے کی اہمیت کو جان سکی۔ پھر بھی میں نے اسے محبت کی۔ انہیں اپنے سے مانوس کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جیسا اس کے ابا کہتے۔ میں ویسا ہی کرتی۔ کلیم بہت چھوٹا تھا۔ اسے میں نے ہی پالا۔ اپنے ساتھ اسے سلانی اور اس کے ساتھ رات کو جاگتی۔ دن کو بھی وہی ساری محنت اور کوشش کرتی کہ جو ساری دنیا کی مائیں کرتی ہیں۔

معین کو بھی مانوس کرنے کے ساتھ بلتن میں نے کیے۔ مگر وہ خود سے قریب نہ ہوا۔ میں جتنا زیادہ اس کو پیار کرتی۔ اسے اپنا بنانے کے لیے اس کی ضدیں پوری کرتی۔ وہ اور بھی ضد کرتا۔ توڑ پھوڑ۔ یہاں تک کہ میں سے ڈرنے لگی۔ صفی اللہ بہت سمجھ دار تھے۔ اور فرماں بردار بھی۔ وہ میری کوششوں کو سراہتے۔ اور جب میں معین کے ہاتھوں ذلیل ہوتی اور رونے لگتی۔ وہ بچے تسلی دیتے اور معین کو ڈانٹتے۔ سمجھاتے مگر وہ صفی اللہ سے بھی بدتمیزی کرتا۔ اس عرصے میں تمہاری دادی کا انتقال ہو گیا اور اشفاق بھی میرے پاس آ گیا۔ وہ بھی بچے ہی تھا۔ فریش نے اسے بھی ویسے ہی ماں کی چاہت دی اور معین کے ساتھ اسے بھی اپنے ساتھ سلاتی۔ معین کو میرے ساتھ ہی بھیجے ہوگی۔ اور پھر اشفاق سے بھی۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ میں جو اپنی کی خواہش پوری کرنے کی ہوں۔

امی کی خدمت میں رہوں، امی سے پیار کروں۔ جب بھی میں کلیم اور اشفاق کو پیار کرتی معین، نوفلے اور جنون کا دورہ پڑ جاتا۔ میں کلیم سے دست بردار نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بہت چھوٹا تھا اور اسے میں نے اس ان مانوں کیا تھا جیسے وہ میرا ہی بیٹا ہو۔ وہ میرے لیے ان دنوں ایک کھلونے کی طرح محبوب تھا۔ معین کے غصے سے ڈر کر میں اور بھی اس سے دور ہو گئی۔ وہ بدتمیز ہو گیا۔ اور میں کچھ نہ کر سکی۔

میرے ہاں کئی لڑکیاں پیدا ہو کر مر گئیں، صرف شاہین زندہ رہی۔ شاید اس لیے بھی میری محبت ان لڑکوں سے بڑھتی جاتی تھی۔ میں معین کو بھی اتنا ہی چاہتی تھی۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ جب میرا بیٹا ہوا۔ میں نے اس پر کلیم اشفاق اور معین کو ہر طرح فوقیت دی۔ خاص طور پر معین کو۔ تاکہ اسے یہ خیال نہ ہو کہ اپنی اولاد کے مقابلے میں میں اسے نظر انداز کر رہی ہوں۔ میں بیمار بھی ہوتی تو معین کے لیے تندرست ہو جاتی۔ کلیم اور صفی اللہ مجھ سے ہمدردی کرتے۔ اور میری بیماری میں خدمت بھی کرتے مگر معین سے میں اپنی بیماری بھی چھپاتی اور اس کے سب کام اور ساری خدمتیں پوری کرتی۔ کیا کیا بتاؤں۔ بہت لمبی کہانی ہے۔"

دوا کی آواز بھرا گئی۔ رومال سے آنکھیں پونچھ کر انہوں نے اصفیہ کے اداس چہرے کو دیکھا اور مسکرا دیں۔ دوا بھی کیا چیز ہیں۔ اصفیہ سوچ میں پڑ گئی۔ پرانا وقت یاد کر کے دوا دکھی ہیں۔

"تم اشفاق کی بیٹی ہو نا۔ اس لیے تمہیں مجھ سے بے حد ہمدردی ہو رہی ہے۔ اشفاق بھی میرا بہت درد رکھتا تھا۔ کلیم اور صفی اللہ کی طرح خیال رکھتا تھا۔ بس انہیں کی۔۔۔ غلطیوں سے میں جی اٹھی تھی۔ ورنہ معین نے تو میری ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ بیڑیوں کے سامنے بھی جب میں ان بچوں کو اپناتا تھی چکی۔"

"تم میری ماں نہیں ہو۔ تم موتیلی ہو۔ میری ماں تو مر

میں بھی اس لیے مر جاتی۔ میرا دل ٹوٹ جاتا۔ جگر کلیم کی محبت اشفاق اور صفی اللہ کی چاہت مجھے زندہ رکھتی اور پھر جب یہ بڑے ہوئے۔ ان کا باپ فوت ہو گیا۔ پھر میں نے ہی ان کی شادیاں کیں۔ صفی اللہ، کلیم اور اشفاق کی شادی میری پسند سے ہوئی۔ بہوئیں یہاں بھی کچھ پر بھروسہ نہ کر سکا۔ اس گھر کا بٹوارہ کر دیا۔ تاکہ سب اپنے اپنے گھر کو اپنی مرضی سے سجا لیں بنا لیں۔ اپنی زندگی اپنے طور پر بسر کریں۔ اب اتنے برسوں کے بعد میں نے معین میں انسانیت کے آثار پائے۔ وہ شادی کے بعد الگ بسنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ مگر میں بہت تھک چکی تھی۔ میری ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ بڑھاپے کی آمد تھی۔ اور میرے بھی بچے تھے۔ جو آج تک میری محبتوں سے محروم ہی رہے تھے۔ خیر، وہ وقت اب گزر گیا۔ معین مجھ سے بدتمیزی نہیں کرتے۔ مگر کبھی کبھار جنون کی لہر آتی ہے تو صفی اللہ سے بدتمیزی کر بیٹھتے ہیں۔ بعد میں صفائی مانگنے کا سلسلہ۔ وہ اپنی بیوی کو بھی نہیں بخشتا جسے خود ضد کر کے بیاہ کر لایا تھا۔ بچے بھی اس کے غصے کی زد میں آتے ہیں۔ اب تو معین مجھ سے کچھ ڈرتا بھی ہے یا شاید لحاظ کرتا ہے۔ میری عمر کا یا میری محنت کا۔ جو میں نے اس کی زندگی بنانے اور تربیت کرنے کے سلسلے میں کی تھی۔ خیر، بیٹی! وقت گزر گیا۔ جو باقی ہے وہ بھی گزر جائے گا۔"

دوا اپنے ان بیٹوں کی ماں نہیں۔ یہ انکشاف اصفیہ کے لیے حیرت ناک تھا۔ مگر یہ بات اور بھی چونکا دینے والی تھی کہ دوا نے اسے تنبیہ کی۔

"ہمدرد! جو تم نے کسی کے آگے بھی یہ بات دہرائی تو یاد رکھنا اشفاق کو بلا کر ان کے سامنے سو جوتے تمہارے سر پر ماروں گی۔ اور بھیج دوں گی تمہاری نانی کے گھر۔"

انہوں نے ڈرا کر کہا۔ پھر بڑبڑانے لگیں۔ "میں بھی اس فتنی نے آگے کیا کہہ بیٹھی۔ سچ کہتی ہے شاہین۔ میں تو اس کے آگے مجبور ہو جاتی ہوں۔ بھلا یہ سب اسے سننے کی باتیں ہیں۔"

اصفیہ نے کان پکڑ کر توبہ کی کہ وہ کبھی بھی کسی سے کچھ نہ کہے گی۔ وہ باؤلی تو نہیں تھی۔ اس نے ادھر منہ سے ایک لفظ کہا نہیں کہ نانا کے گھر بھجوائی نہیں گئی۔ بس اب یہ بات اسے کسی قیمت منظور نہیں تھی۔

اس دن وہ ٹوٹن کے بعد گھر آ رہی تھیں کہ بس راستے میں خراب ہو گئی۔ راستے میں اترنا پڑا۔ اور پیدل گھر کی طرف چلیں۔ بڑے چچا کا گھر زیادہ قریب تھا۔ اس لیے وہ اس راستے پر مڑ گئیں۔ ایک تو امتحان کا خوف، پھر بھی اچھا نہیں ہوا تھا۔ اوپر سے بھوک نے پیٹ میں اودھم مچا رکھا تھا۔ شفق اور جناب کی گھر کے اندر پہنچ گئیں۔ وہ بستی اور بیزاری سے چپل گھسیٹتی جا رہی تھی۔ جانے کدھر سے ایک بم کا گولہ اس کے سر پر پھٹا۔ اسے کم از کم یہی لگا۔ سر سہلاتے ہوئے اور یقین کرتے ہوئے کہ وہ ابھی زندہ ہے گو سر پر قیامت

گزر رہی ہے۔ وہ دھندلی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں خود بخود پانی بھر گیا تھا۔ تب ہی "زرا قریب سے آواز آئی۔

"چوٹ تو نہیں لگی؟"

وہ بیچ سڑک کے سر پکڑے کھڑی تھی اور ہاتھ میں پکڑے کاغذ اور امتحانی گتہ زمین پر پڑا تھا۔ آنکھیں دوپٹے سے رگڑ کر اس نے دیکھا۔

"ابھی۔"

سلوی کا بھائی، وہی جس کے بال سیدھے اور بھورے تھے اور جس کی آنکھوں میں تمسخر تھا۔

"تو یہ تم تھے۔" وہ اسے مارنے کو لپکی لیکن غصہ اس قدر تھا کہ وہ پاس ہوتا تو کچا چبا ڈالتی۔

"دیکھو۔ دیکھو۔" وہ گھبرا کر بولا۔ "تم نے میرا گریبان پکڑ کر اچھا نہیں کیا۔ مجھے بھی جواب دینا آتا ہے اور میں۔۔۔"

"تم نے مجھے پتھر مارا۔ میں تمہارا گریبان بھی پکڑوں گی۔ میں تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"میں نے پتھر نہیں مارا۔" وہ کھسیانے سے لگا۔ اس کی آنکھوں میں تمسخر نہیں کچھ شرمندگی تھی۔ "ہم کرکٹ کھیل رہے تھے۔ گیند باہر آ گئی۔ تمہارے لگ گئی۔ میرا قصور نہیں ہے۔ تم کیوں سڑک پر ہو۔"

"اچھا سڑک پر نہیں تو کیا تمہارے سر پر چلیں۔" وہ چڑ گئی۔ جیسے اس کے باپ کی سڑک تھی نا۔

"بھئی چلو، غلطی ہو گئی۔ ہائیں، یہ سڑک پر بدتمیزی۔ یاد رکھو مجھے بھی کرانے آتا ہے ابھی ایک ہاتھ دوں گا ڈوئیک ہو جاؤ گے تم ہمارے۔"

اصفیہ جو اس کے سینے پر گھونسہ جما چکی تھی۔ دوسرے کے لیے تھی باندھ کر گھمانے والی تھی کہ اس کا گریبان چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اور شوق بھرے لہجے میں بولی۔

"ارے کراٹے آتے ہیں۔ ہمیں سکھا دو گے ہیں؟"

اب وہ اترانے لگا۔ گریبان ٹھیک کر کے بٹن لگاتے ہوئے بولا۔

"تم نے میری انسلٹ کی ہے۔ میں کیوں نہیں سکھاؤں۔"

"تم نے میرے سر پر بم کا گولہ دے مارا۔ یہ دیکھو۔ کتنا بڑا گومڑ ہے۔" اصفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔ جہاں واقعی ایک اور گیند نمودار ہو گئی تھی۔

"اگر ہم کسی سے شکایت کریں تو تمہاری تو شامت ہی آ جائے گی۔"

وہ گھبرا کر بولا۔ "اچھا اچھا۔ سکھا دوں گا۔"

"ہمارے امتحان ہو رہے ہیں۔ امتحان ختم ہونے کے بعد ہم آئیں گے۔" اس نے کہا۔ "نام۔ نام تو بتاؤ۔"

"پہلے تم بتاؤ۔ میں تو نہیں ستارہ والی ہی کہتا ہوں۔"

"ہمارا نام۔" اصفیہ سوچ میں پڑ گئی۔ ایک دھچکا سا لگا۔ کوا اپنا نام بتائے۔ دوا کو خبر ہو گئی تو ڈانٹ پڑے گی۔

"بھئی، ہمارا نام کچھ بھی ہو۔ تم بتاؤ اپنا نام۔"

"میرا نام ہے چاند اور میں ہوں ستارا کہوں گا ٹھیک ہے؟" زمین سے گیند اٹھا کر وہ بھاگ پڑا۔ اور اصفیہ کے کاغذ، قلم اور امتحانی گتہ یوں ہی خاک میں پڑے رہے۔

"بدتمیز۔" یہ کہہ کر اکارے کا غذ ہی پکڑا دیتا۔ تھکی ہاری سر میں درد اور فیل ٹینس کی گیند جتنا گومڑ لیے گھر میں آئی۔ تو بھوک نے نقاہت کی حد کر دی۔ پلنگ پر گر کر وہ دوا دوا کرنے لگی۔

"ہائے سخت بھوک لگی ہے۔ بس خراب ہو گئی تھی۔ راستے میں کم بخت نے اتار دیا۔ چلتے چلتے پیر ٹوٹ گئے۔ دوا! سخت حالت خراب ہے۔ جان نکلی جا رہی ہے۔" کہہ کر سر پکڑ کر لیٹ گئی۔

دوا نے حیرانی سے کہا۔ "بھوک لگی ہے تو سر میں کیا ہوا؟" وہ مسکرا رہی تھیں۔ دوا کو مسکراتے کبھی نہ دیکھا تھا اس نے۔

"گرا سے اس کی پروا نہ تھی۔ دوا نے پھر کہا۔

"ذرا سا انتظار کر لیتیں تو سب ہی ساتھ کھا لیتے۔"

اس اثنا میں اشرفی بوا کھانے لائی تھیں۔ اصفیہ نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور فوراً تو میں کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

"سب کون دوا؟"

مگر وہ اب وہاں سے ہٹ کر کسی کام کاج میں لگ گئی تھیں۔ کھانا وغیرہ کھا کر وہ پھر بستر میں اودھ گئی۔ فوراً ہی نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔ آج کل نیند اس پر زیادہ ہی طاری رہتی۔ خصوصاً پڑھنے میں۔ کتاب سامنے آئی نہیں کہ کوئی اسے لوریاں دینے لگتا۔ کچھ یاد کرتی تو پلکیں ایسی بھاری ہو جاتیں کہ جنتی محال ہو جاتی اور دماغ سب سے پہلے سو جاتا۔

اسی شام وہ کھیر پی کے گھر کی سیڑھیاں پڑھ رہی تھی تو وہ سے لڑکوں کی چیخیں سنائی دیں۔ شاید کھیل ہو رہا تھا۔ گھر ماسٹر صاحب آ گئے تھے اور کھیر پی کئی بار اسے بلوا چکی تھیں۔ اب بھی شفق اوپر کی سیڑھیوں پر کھڑی اسے پکار رہی تھی۔ ماسٹر صاحب ایک پیالی چائے نوش جان کر چکے تھے۔ ان کا دل تو لان میں کھیلنے والے بچے میں لگا ہوا تھا۔ وہ بے دلی سے ماسٹر صاحب کا لیکچر سننے لگی۔ جو بھی

ماسٹر صاحب حنا کی جانب متوجہ ہوئے۔ وہ منڈیر پر کھڑی ہوگئی۔ سورج کی طرف ہاتھ کا چھجہ بنا کر لان میں دیکھنے لگی۔ جب اور فیض بیٹنگ کر رہے تھے۔ فخر باؤلنگ۔ ایک منٹ میں دونوں آؤٹ ہو گئے۔ یہ فخر کی باؤلنگ کا کمال نہ تھا۔ وکٹ کیپر کے لمبے بازو اور لمبی ٹانگوں کے علاوہ مہارت کا کمال تھا۔ پورچ کی آڑ میں وکٹ کیپر چھپا ہوا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھ نظر آجاتے۔

"ہم بھی کھیلیں گے فخر!" اس نے اوپر سے ہی پکارا۔ دل مانا نہیں آخر۔

"جی نہیں۔ آپ پہلے پڑھیں گی۔" ماسٹر صاحب نے لینک کے اوپر سے اسے گھورا۔

"جلدی آئیے۔ میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو آؤٹ کر دوں گا۔" نیچے سے فخر نے کہا۔

"ماسٹر صاحب! بس ابھی آؤٹ ہو کر آتے ہیں ہم۔" اس نے لجاجت سے کہا۔ اور دھم سے پورچ کی چھت پر کود گئی۔ مگر سامنے نظر پڑتے ہی سٹی گم ہو گئی۔ وکٹ کے پیچھے تو لمبی مونچھوں والا مرد۔ کھڑا تھا۔ اچھا خاصا لم ڈھینگ۔

"ہائے اللہ! اب کیا ہو۔" فیض اور رجب اسے چلا چلا کر بلانے لگے۔ وکٹ کیپر کی حیران نظروں کے سامنے شرمندگی مٹانے کو وہ نیچے لان کے سبزے میں چھلانگ لگا کر اٹھی تو جان ہی نکل گئی۔ پیر مڑ گیا تھا۔

فیض کا بیٹ پکڑ کر لنگڑاتے ہوئے وہ وکٹوں کے آگے ڈٹ گئی۔ پہلی بال وکٹ کیپر سے مس ہو گئی یا اس نے جان بوجھ کر چھوڑ دی۔ دوسری بال پر اس نے شاٹ کھیلا۔ گیند رجب کے پاس گری جو فیلڈر تھے۔ اب عزت دوسری وکٹ سے دوڑ کر اس کے پاس آگئے۔ مگر وہ جمی کھڑی رہی۔

"ہم بھاگ نہیں سکتے۔ پیر میں موچ آگئی ہے۔" اس نے اعلان کیا۔

عزت رن آؤٹ ہو گیا۔ اس کی اگلی گیند پر وہ ذرا گھومی۔ وکٹ کیپر اسے گھورے جا رہا تھا۔ اس وقت گیند وکٹوں سے لگی۔ بیٹ پھینک کر بڑبڑاتی وہ واپس پورچ کی طرف چلی۔ فیض کی پیٹھ پر چڑھ کر ستون کے اکھڑے پلاسٹر میں پنجے جما کر چھت پر جا پہنچی۔ اور وہاں سے اچک اچک کر کنگورے پر اور پھر منڈیر سے دیوار تک پہنچنا کیا مشکل تھا۔

"ماسٹر صاحب! زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟"

ادب سے پوچھا گیا۔ اس عرصے میں ماسٹر صاحب چائے کا ایک قدح چڑھا چکے تھے۔ اس دن پٹرول زیادہ ہو گیا اور وہ مغرب کے بعد تک پڑھاتے رہے۔ تھکی ہوئی، لنگڑاتی ہوئی، سر درد سے نڈھال وہ گھر پہنچی۔ بھوک نے بھی ستایا تھا۔ وہ کچھ کھانے کا کہہ کر بستر میں جا گھسی۔

"ہوں، ہوں۔" دوا نے ٹوکا۔ انہیں سرِ شام بستر میں لیٹنا پسند نہ تھا۔ "نماز پڑھو۔"

"پڑھ لی تھی۔ کلیم چچی کے ہاں۔ پوچھ لیں آپ۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"اچھا، بستر میں کیوں لیٹی ہو۔ اٹھو۔ کھانا کھا کر لیٹنا۔"

"دادا! بہت سردی لگ رہی ہے۔ بس ابھی اٹھتے ہیں۔ اشرفی بوا۔ کچھ کھانے کو دو نا۔"

"اوئی بیٹی۔ تم کو کس دن سردی لگی ہے۔" دوا تعجب سے کہنے لگیں۔ "سوئیٹر تم نہ پہنو۔ ہوا میں ننگے پیر تم دوڑو۔ رات کو صحن میں کودتی پھرتی ہو۔ اب یہ کون سا سردی کا وقت چنا تم نے۔"

"دادا! پیر میں بہت درد ہے۔" اشرفی کمبخت کی نظر لگ گئی۔ ہر وقت لوکتی رہتی تھی۔"

"اے ہے بیٹی! بہت بری بات ہے۔ کسی کو اس طرح نہیں کہنا چاہیے۔ الزام لگانا اللہ کو پسند نہیں۔"

انگیٹھی کے سامنے اشرفی اس کے پیر کی مالش زیتون کے تیل سے کر رہی تھیں کہ وہ وکٹ کیپر دندناتا ہوا بے تکلف اندر چلا آیا۔ لم ڈھینگ۔ سٹپٹا کر شلوار نیچے کھینچ کر وہ سوچتی رہ گئی۔ کہ اسے غصہ کرنا چاہیے یا حیران ہونا چاہیے۔

"کھانے میں کیا دیر ہے؟" انہوں نے ایک لٹھ سا دے مارا۔

"ارے بیٹا تیار ہی ہے۔" دوا نے لہک کر کہا۔ ان حضرت نے ابرو کے اشارے سے دوا سے پوچھا۔

"یہ کیا چیز ہے؟" صریحاً زیادتی تھی۔

"ارے ہاں۔ اپنے اشفاق کی بیٹی ہے۔" دوا کی آواز میں بھی خوشی کی کھنک تھی۔

"اسپیہ بی بی ہے ان کا نام۔" اشرفی نے کانوں تک باچھیں پھیلا کر کہا۔

"اسپ تازی تو سنا ہے۔" انہوں نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ اسپیہ یعنی گھوڑی۔ میں بھی کتنا ناواقف ہوں۔"

وہ کھڑی ہوئی تو پیر میں درد محسوس ہوا۔ اشرفی بوا کا سہارا لے لیا۔

"فعل لگا رہی تھیں کیا بوا؟" انہوں نے بغور اسے دیکھ کر کہا۔ صریحاً زیادتی۔ وہ بھنا گئی۔ اور تیزی سے پھدکتی کھانے کی چوکی تک پہنچی۔

"میں تو اس۔ یعنی اشفاق بھائی کی لڑکی کو جانتا نہیں۔"

انہوں نے پھر اسے موضوعِ گفتگو بنانا چاہا۔ "یہ کہاں سے ٹپک پڑیں۔"

پھر وہی۔ اصفیہ اب چپ نہ رہ سکی۔ دادا کہتی تھیں کہ لڑکیوں کو زیادہ نہ بولنا چاہیے۔ بڑوں سے زبان درازی نہیں کرنا چاہیے۔ مگر صبر و برداشت کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ یہ دادا اسے بتانا بھول گئیں۔

"ہم جی آپ کو نہیں جانتے کہاں سے ٹپک پڑے ہیں بیٹھے بیٹھے۔"

وہ بڑبڑائی دادا ناراضی سے حلوہ نکال رہی تھیں۔ انہوں نے نہیں سنا مگر جیسے وہ سنانا چاہتی تھی۔ اس نے سن لیا اور ڈھٹائی سے ہنسے۔

"یہ شہباز بھائی سے بالکل نہیں ملتی۔" انہوں نے ہاتھ دھو کر کہا۔ اصفیہ غصے کی پلیٹ کھول رہی تھی۔

"کاہے تم کیوں جلیں۔ وہ کرن ہماری سگی ماں ہیں۔"

"یہ یہ۔" اچانک انہیں کوئی دکھ پہنچا۔ دھکا سا لگا۔ کچھ کہہ نہ سکے۔ جگ فتح ہو گیا۔ پھر خود کو سنبھال کر دادا سے کہا۔ "یہ رشتے۔ یہ نقلی رشتے۔ اماں جی! یہ وہاں بھی ہیں۔ ان سے نہیں نبھتا۔ ہے کہ نہیں۔ یہ مصنوعی خول والے رشتے۔"

"کوئی رشتہ مصنوعی ہوتا ہے نہ نقلی۔ بیٹا ہر انسان کا ہر انسان سے رشتہ ہے۔ محبت کا انسانیت کا۔ رواداری اور مروت کا۔ گرمیں تم کو کبھی یقین نہیں دلا سکتی۔" دادا نے سنجیدگی سے کہا۔ "اپنی سوچ کو بدلنے کی کوشش کرو۔ میرے بچے، انتہا پسندی بہت اذیت پہنچاتی ہے انسان کو۔"

"جو چیز سامنے ہو صاف نظر آتی ہے۔ اسے۔ نظر انداز کر دیا جائے۔ یا جھٹلا دیا جائے۔ یہ حقیقت پسندی تو نہیں اماں۔" انہوں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

دادی پوتی پر گھنیں نظر آتا تھیں۔ اصفیہ کی کچھ میں ایک بات بھی نہ آئی۔ سوائے اس کے کہ یہ شخص دادا بننا ہے۔ اس کی کسی بات کا اس نے کبھی دوٹوک اقرار نہیں کیا۔

"جو چیز نظر آرہی ہے وہ ناظر کا دھوکہ بھی ہو سکتی ہے۔" دادا ایک منٹ چپ رہ کر بولیں۔ "اعتدال، ہر حالت میں اچھا ہوتا ہے۔ اور نہ نفی نہ اثبات کو بنیاد بنا کر زندگی تلخ کرنے کے درپے رہتے ہو۔ اپنی بھی دوسروں کی بھی۔"

"اپنی زندگی کا میں خود ذمہ دار ہوں۔ وہ تلخ ہو۔ یا خوشگوار۔ کسی کو میری زندگی سے کوئی دلچسپی ہے، نہ تعلق۔" انہوں نے نہایت تلخی سے کہا۔ آواز بھی بلند ہو گئی۔ "اور میری وجہ سے کسی دوسرے کی زندگی تلخ ہو رہی ہے تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے۔ اس غلطی سے بچانے کے لیے میں سب سے الگ الگ، دور دور رہتا ہوں۔ مگر پتہ نہیں کس طرح نہ چاہنے پر بھی ادھر آجاتا ہوں۔ ذلت اٹھانے کے لیے۔ سخت سست سننے اور تحقیر برداشت کرنے۔"

غصے اور رنج سے ان کا چہرہ سُرخ انگارہ ہو گیا۔ دادا پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ اور سر تھام کر بولیں۔

"نہیں بولوں گی اب چپ رہوں گی۔"

اصفیہ جلدی سے دادا کے پاس جا بیٹھی۔ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کندھے سے سر ٹیک دیا۔ اسے دادا کی اس اداسی سے بہت رنج ہوا۔

"دادا! آپ نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ چلیے پہلے کھانا کھالیں۔" دادا کو سر ہلاتے دیکھ کر جلدی سے دیکھ کر کہا۔ "تو چائے بنا دیں؟"

"سب کچھ کھا لیا۔ پی لیا۔ اب بھوک نہیں بیٹی! تم جاؤ کچھ پڑھ لو۔ صبح کالج کا پیپر ہے؟" دادا نے بہت پست آواز میں کہا۔

شاید دادا کی آواز اور لہجے کی کمزوری نے بیٹے کے دل پر بہت اثر کیا۔ وہ آگے آئے اور دادا کے دوسری جانب بیٹھ کر انہیں اپنے بازو سے تھام لیا۔

"اماں! معاف کر دیں۔ میں آپ کو کتنا تنگ کرتا ہوں۔ بہت برا ہوں نا۔ میری وجہ سے بھوکی رہیں گی۔ تو کیا میں خود کو معاف کروں گا۔ سوچ لیں۔"

ان کے لہجے میں عفو تھا۔ گرمی، چہرے پر ندامت اور آواز میں لجاجت اور ایک طرح کی ضد بھی تھی۔ دادا نے بیٹے کے گھنے بالوں والے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ان کے چہرے پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ گو کہ آنکھیں اب بھی اداس تھیں۔

"پیٹ بھر کھا چکی ہوں۔ بھوک نہیں۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔ "معظم! میں کھا چکی ہوں۔"

معظم نے پیار سے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں! میری خاطر۔" اور دادا کو خاموش پا کر اصفیہ سے کہا۔ "پیپر تازی چیلو۔ اماں کا کھانا ہمیں لے آؤ۔ آج میں خود اپنی اماں کو کھانا کھلاؤں گا۔" اصفیہ لنگڑاتی ہوئی کھانے کی چوکی پر جا بیٹھی۔

چند منٹ میں ہی ماحول خوشگوار ہو گیا۔ "اچھا تو یہ اشفاق بھائی کی اسپیشل تازی بلکہ اسپیشل تازیہ کس سلسلے میں یہاں پائی جاتی ہیں؟"

معظم نے پھر جواب نہ پا کر سایا۔ وہ دادا کو دیکھ کر رہ گئی۔

"پڑھنے آئی ہے۔" دادا اب اطمینان سے بیٹھی تھیں۔ ماتھے کی شکنیں اور آنکھوں میں اداسی کا دور دور پتہ نہ تھا۔

"اشفاق بھائی کے شہر میں اسکول نہیں ہوتے؟"

"اسے یہ تو اپنی نانی کے ہاں رہتی تھی۔ مارے لاڈ کے نانی نے اسے پڑھایا نہیں۔ اب اشفاق اسے یہاں لے آئے۔"

"نانی کے ہاں؟ وہ کیوں؟ کیا واقعی شہباز بھائی۔"

"ارے نہیں بیٹا!" دادا جلدی سے بولیں۔ "اس کی نانی سدا سے ایسی ہیں۔ سوچے سمجھے بغیر جو منہ میں آئے کہہ دیتی ہیں۔ جو چاہتی ہیں کر گزرتی ہیں۔ نتیجے کی فکر نہیں کرتیں۔ بس تو سٹھیا گئی ہیں۔ کبھی منہ سے نکل گیا ہوگا کہ وہ تمہاری ماں نہیں۔ اس نے پتے باندھ لیا۔ اصل میں اب وہ اس کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ بہار رہنے لگی ہیں۔ لاکھ ماموں، ممانی محبت کریں مگر ذمہ داری تو نانی کی تھی۔ ادھر اشفاق بھی اس کی عادتوں سے نالاں۔ نانی نے اسے جانے کیا بنا دیا۔ اکلی۔ کھوپڑی کی ہو کر رہ گئی۔ لاکھ میں سمجھاتی ہوں کہ وہی سگی ماں ہیں۔ مگر جو نانی نے اسے کہہ دیا۔ وہی پتھر کی لکیر ہو گئی۔ کبھی غصے میں لہجہ دیتی ہوں گی۔ یہ سچ سمجھی۔"

اصفیہ دیر سے چپ تھی۔ اب برداشت نہ کر سکی ہوں۔

"ہونہہ۔ سگی ماں ایسی ہوتی ہیں کوئی۔ جب ہم پیدا ہوئے ہیں، انہیں اختلاج ہونے لگتا ہے۔ ہماری صورت سے انہیں نفرت ہے۔ ہر وقت ابا سے شکایتیں۔ اسی لیے نانی نے کہا کہ ماں ہوتی تو پیار کرتی۔ وہ تیری کوئی نہیں۔"

"اچھا، بس، سن لیا۔ چپ ہو جاؤ۔" دادا نے ڈانٹا۔ "ہر ایک کے سامنے بک بک کرنے لگتی ہو۔ لڑکیوں کو اتنا نہیں بولنا چاہیے۔ اس لیے اختلاج ہوتا ہے۔ اوٹ پٹانگ بولتی رہتی ہو اور حرکتیں جو ہیں وہ الگ۔ ایک بیٹی وہ بھی ایسی۔ اے اللہ! لڑکی دے تو اس کا نصیب بھی اچھا دے۔ اب اس کے مقدر میں پتہ نہیں کیا ہے۔"

صبح وہ امتحان دے کر دوڑتی ہوئی آئی۔ معظم برآمدے میں کھڑے تھے۔ بولے۔

"مہینے میں کتنے بار فعل لگواتی ہو تازی؟"

"ہمارا نام تازی نہیں ہے۔"

"میں نے تم کو گھوڑی نہیں کہا۔ اسپیشیز گھوڑی ہی ہوتی ہے۔ اس کا دل چاہا ہے تم بھی ساری کی نسل کے ہو مگر چپ رہی۔ دادا کی نصیحتوں نے اسے چپ رہنا سکھا دیا تھا۔ ویسے بھی امتحان کی دہشت سے وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ آج کا پیپر کچھ بہتر ہوا تھا۔ اسٹر صاحب پابندی سے آتے۔ بیسیوں بار چالے پڑھا جاتے۔ مگر لڑکیوں کے دماغ میں کافی علم ٹھونس دیتے۔ دادا کہتی تھیں۔ فرسٹ ڈویژن نہ سہی سیکنڈ ڈویژن تو آئے۔ انہیں زیادہ فکر اصفیہ کی تھی۔ آدمی کا بچہ بن جائے۔ دوسرے گھر جانا ہے۔

اس کی نفسیات بھی خاص قسم کی تھی۔ ہر کوئی اسے سمجھ نہیں سکتا۔ ماں باپ ہی اس کی فطرت سے ناواقف تھے۔ وہ اسے ستاتی رہتی تھیں۔ آدمی کی قدر کام سے ہوتی ہے نام سے نہیں۔ اطاعت، خدمت، انکساری اور دوسروں کے درد کا احساس جب تک نہ ہو آدمی کا وجود بیکار ہوتا ہے۔ نہ وہ اپنے لیے کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اور نہ دوسروں کو کچھ دے سکتا ہے۔ اور جو کسی کو کچھ نہ دے، کسی کے کام نہ آئے۔ وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

اصفیہ کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ سنتی بہت توجہ سے اور سمجھتی بہت آسانی سے۔ ہر ایک کے سامنے ایسی تقریر جھاڑتی کہ سب حیران ہو جاتے۔ اپنی قابلیت، بہادری اور عزم کے بارے میں ایسے خیالات ظاہر کرتی کہ توڑے چچا اور کلیم چچا خوب واہ واہ کرتے۔ جوش دلاتے۔ ایسے میں دادا کی نصیحتیں دور کسی کونے میں منہ چھپا لیتیں۔ دماغ صاف ہو جاتا اور سنسنٹے دار دلچسپ ترکیبیں ذہن میں کھلبلی مچاتیں جو تھوڑا وقت امتحان کے بعد کھیل کے لیے بڑے چچا کی سفارش پر دیا گیا۔ اس میں وہ بقول کلیم چچا تماشے اور گھڑے کرتی۔

جب کہ باقی لڑکیاں بیڈمنٹن کھیلتیں یا کیرم۔ دادا کے پاس پہنچ کر اسے یاد آتا کہ دادا نے تو اسے کئی کام دیے تھے جنہیں وہ بھول چکی ہے۔ اشرفی کے کرتے کا دامن ترپنا تھا۔ صفیہ چچی کے کرتے میں پھول آ رہے تھے یا جمعدارنی کے پوتے کا جانگیہ سینا تھا اور دادا نے اپنا سفید کلف دار دوپٹہ چننے کے لیے دیا تھا۔ کہا تھا جب بھی وقت ہو چن دینا۔ مگر اسے وقت ہی نہیں ملتا۔

خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوئے۔ خدا بخش آیا۔ سلومی کا بھائی ایک روز ملا۔ وہ سڑک پر تھا۔ اصفیہ گیٹ پر کھڑی تھی عزت قریب کی دکان سے گنڈیریاں لینے گیا تھا۔ اب بھٹے گرم کھیلے کا موسم آگیا تھا۔ چاند نے ہاتھ ہلا کر مسکرا کر پوچھا۔

"کب آؤ گی کرائے سیکھنے؟"

تب اسے یاد آیا کہ وہ تو چاند سے کڑھائی سیکھنے کا پروگرام بنا چکی تھی۔ مگر چاند دی تو ہے جو اس دن سانگرہ پر اس کا مذاق اڑا رہا تھا اور پھر کرکٹ کی گیند اس نے سر پر دے ماری تھی جس کا گومڑا کئی دن رہا اور بہت دن تک وہ جگہ دکھتی رہی۔ بہت خراب ہے یہ۔ اس نے منہ چڑا کر انکار کر دیا۔ مگر پطرس کے کھیل نے اسے بہت پریشان کیا۔

کلیم چی نے بھی اس کھیل میں اصفیہ کی شرکت کی مخالفت کی اور پھر عزت رتب اس قدر زور سے گیند مارتے کہ اصغر کی پیٹھ، بازو، جہاں گیند آکر لگتی۔ درد سے سن ہو جاتی۔ کئی کئی گھنٹے ٹیس اٹھتی رہتی۔ یہ اتنے ذرا سے لڑکوں میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے۔ وہ تعجب سے سوچتی۔ وہ خود پوری طاقت سے گیند ان کو مارتی لیکن ان پر ذرا اثر نہ ہوتا۔ اشرفی بوا کے کہنے پر اس نے ایک کبوتا پیاز دودھ کے صحن میں لاکر لگایا تھا۔ اس میں ہلکی ہلکی بھورل آئے تھے۔ بڑی نرالی سی خوشبو تھی۔ بدبو کرنے والی کھٹی میٹھی تیز اور بھینی۔ اصفیہ کئی بار جاکر پھولوں سے ناک لگا کر سونگھتی۔

ایک دن دادا نے ان پھولوں کو توڑنے کا حکم صادر کر دیا۔ عزت، امین اور جب سب خوشامد کرنے لگے کہ پھول نہ توڑے جائیں تو بھی نہیں مانے گے۔ ہم کھائیں گے۔ پھل ہی نہ لگنے دیے جائیں تو بیج لگانے کا فائدہ کیا۔

دادا کا وہی جواب تھا۔ بیڑا بھی کمزور ہے۔ پھلوں کا بوجھ سہار نہ سکے گا۔ پھول توڑ دیے جائیں تو وہ اگلی فصل پر طاقت ور ہو جائے گا۔ پھر اس پر فصل بہار کا روپ ہوگا۔ اور پھل بھی زیادہ آئیں گے۔ وہاں کی پرورش کرنے کے قابل ہو گا۔ پھر پھول بے ثمر اور اگر پھول پھل کے روپ میں آبھی جائے تو وقت سے پہلے شاخ سے گر جاتا ہے۔

کسی کی سمجھ میں یہ فلسفہ نہ آیا مگر دادا کا فیصلہ سب پر حاوی تھا۔ جامن کے پیڑ میں اب پھل آرہا تھا۔ صبح اٹھتے ہی اصفیہ وہاں پہنچ جاتی۔ ہزار اشرفی بوا چلاتیں کہ ابھی ابھی پھل پکے گا۔ کچے خراب ہو جاتے ہیں کھانے سے۔ مگر وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر نہیں سنتی۔ ہر روز ہی اشرفی کی ناک بڑھ جاتی۔ دادا کو خبر ہوتی۔ وہ بے زاری سے کہتے۔ "ہاتھ پر کیا کرلو۔ کسی دن درخت سے گر کے ہاتھ توڑ لے گی۔ لڑکی کو کوئی کھیل کود بھی چاہیے گا۔"

وہ بھی اب اصفیہ کی ہر کوشش کی حامی ہو گئی تھیں۔ ایسے ہی ہنستے کھیلتے دن گزرتے رہے۔ ساون کا مہینہ آیا۔ کھلونے کے گھوڑوں کے حل نہ نکلنے پر اس نے پہلے سے کھلونے

جاتے ہیں۔"

اب اصفیہ نے منجھلے چچا کے گھر جانا شروع کیا تھا۔ امتحان کے زمانے میں حنا کا ساتھ ہوا تو کچھ کچھ دوستی ہو گئی تھی۔ حنا، ثنا دونوں اس سے مرعوب رہتیں۔ وہ انہیں مزید مرعوب کرتی۔ ایک تانگہ پر سائیکل چلاتی۔ ایک پہیے کو اٹھا دیتی اور عرف پچھلے پہیے سے چلاتی۔ بھاری بھاری صوفے اٹھا کر ادھر سے ادھر رکھنا۔ منجھلی چچی کے سارے مشکل کام کرنے میں اسے بہت مزا آتا۔ وہ اصفیہ کی احسان مند رہتیں۔ کبھی کبھی سائیکل پر قریب کی بکری سے ان کے لیے سودا بھی لے آتی۔ منجھلے چچا کے ہاں مہمان بھی بہت آتے۔ ایک روز کوئی مہمان آئے۔ منجھلے چچا تھے نہیں۔ رشکے بھی نہیں۔ اتفاق سے گھر میں کوئی چیز بھی تو ضیافت کے لیے نہیں تھی۔ اشرفی مع آل اولاد کسی رشتے دار سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ اصفیہ نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ چچی کچھ حیران ہوئیں

"امال ناراض ہوں گی۔" انہوں نے کہا۔

"آپ انہیں بتایئے گا مت۔" اصفیہ نے رازداری سے کہا۔ "انہیں خبر ہوگی ہی نہیں۔"

وہ باڑھ کے پاس کھڑی رہیں۔ اصفیہ سائیکل پر تیز تیز پیڈل مارتی بکری سے کیک، پیسٹری، بسکٹ جانے کیا کیا لے آئی۔ اس دن سے اکثر چپکے سے وہ ان کا اس قسم کا کام کر دیتی تھی۔ ایک روز ثنا نے پوچھا۔

"تم کو اکیلے جاتے ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کی کیا بات ہے؟" اس نے بے خوفی سے کہا۔ "راستہ نیا ہے نہ بکری اور اب تو وہ واقف ہو گیا ہے تو جلدی سودا دیتا ہے پیسے بھی کم لیتا ہے۔ اشرفی بوا کا میاں جو سامان دادا کے لیے لاتا ہے نا۔ وہ بہت مہنگا ہوتا ہے۔ دادا ہم سے حساب کرتی ہیں۔"

"تم دادی اماں کے لیے بھی لا دیا کرو۔" حنا نے مشورہ دیا۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ "نا بابا۔ وہ ہمیں سیدھے ابا کے یا نانا کے گھر بھجوا دیں گی اور ابھی ہمیں جو دو کرانے بھی بکھنے ہیں۔"

اب اسے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ جو دو کرانے بھی بہت ضروری ہے اگر نہ سیکھا تو وہ ادھوری رہ جائے گی بقول بڑے چچا کے اس میں اتنی صلاحیت ہے جتنی اس پورے گھرانے کے تمام لوگوں میں مجموعی طور پر نہیں ہے تو وہ صلاحیت مزید نکھارنے کے لیے بکری کے راستے سلمٰی کا گھر تھا۔ چاند اسے ہر بار بلاتا اور وہ بھی اب کچھ رضامند ہو گئی تھی۔ ایک روز وہ بکری گئی تو

ایک چھوکرے کے سر پر ڈھیروں سامان لیے بشاش بشاش واپس آئی۔

بکری کے باہری سلمٰی اور اس کی امی مل گئی تھیں انہوں نے بتایا کہ برابر والے جنرل اسٹور میں زبردست رعایتی سامان مل رہا ہے۔ اسٹور کا مالک کاروبار بند کر کے کہیں باہر جا رہا ہے۔ اس لیے جلد سے جلد سامان فروخت کر رہا ہے۔ اصفیہ کے پاس اتنے پیسے نہ تھے۔ اس لیے بکری والے کو ضامن بنا کر سلمٰی کی امی کے ساتھ پر بہت سی چیزیں لے آئی۔ سب گھر کی ضرورت کی چیزیں تھیں۔ بکری والے نے اپنے لڑکے کو ساتھ بھیجا کہ وہ رقم لے آئے۔

"مگر میں اتنا سامان کیا کروں گی؟" منجھلی چچی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"چچی! آپ پیسے تو دیجیے۔" اصفیہ نے کہا۔ "دادا اور کلیم چچی لے لیں گی۔ باقی سامان۔"

گمان کی کشمکش اور لڑکے نے سب کو پریشان کر دیا۔ تب وہ ٹرکر کلیم چچی کو بلا لائی۔ انہوں نے اس مسئلے کو حل کیا۔ لڑکے کو رقم دے کر رسید لی۔ سامان کھولا گیا۔ تولا گیا اور برابر تقسیم کیا گیا۔ سب چیزیں واقعی رعایتی قیمت کی اور ضرورت کی تھیں۔ کلیم چچی نے اصفیہ کو خوب شاباش دی۔ بڑے چچا اور دادا کے ہاں جب سامان پہنچا۔ دادا نے جو حساب کیا تو اشرفی کو بلا کر اس کی خوب خبر لی اور کہا۔

"تیرا مرد تو مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے۔ کس قدر کمائی کرتا ہے مردود۔"

اشرفی کا میاں صاف انکاری اور اماں جھگڑنے لگا کہ مجھے بتاؤ کس دکان سے آیا ہے یہ سامان۔ اتنا سستا تو منڈی سے ہی مل سکتا ہے۔ دادا نے کلیم چچی سے پوچھا۔ وہ چپ۔ جب بھید کھلا۔ پہلے تو دادا نے اشرفی کے میاں کی مزید خبر لی۔ پھر اکیلے میں اصفیہ کو بلا کر سمجھایا۔

"خاندان کی ناک کٹوا دو گی۔ دیکھا ہے اس گھر کی عورتیں لڑکیوں کو بازار دوکان کرتے ہوئے۔ بائیں۔ دیدوں کا پانی بالکل ہی مر گیا۔ دنیا کتنی خراب ہے۔ تمہیں کیا خبر۔ غضب خدا کا بچے خبر بھی نہیں۔"

معظم نے سنا تو کہا۔ "اماں بی۔ اب دنیا اتنی بھی خراب نہیں۔ لڑکیاں تو اب بہت آگے نکل گئی ہیں۔ آپ گھر میں بٹھا کر انہیں کچھ نہیں سکھا سکیں گی۔ اس میں اتنی جرأت اور اعتماد ہے۔ اس کو کم ہمت نہ بنایئے۔ آپ کا نقصان تو نہیں ہوا نا۔"

"ہرات میں فائدہ نقصان نہیں دیکھا جاتا۔" دادا نے بگڑ کر کہا۔

"مگر آپ تو خود فائدے کے پیکر میں رہتی ہیں۔" معظم نے تیزی سے کہا۔ "اس کو کچھ دو۔ تمہارا بھلا ہوگا۔ اس کے ساتھ محبت کرو۔ تمہارا فائدہ ہے۔ اس کے ساتھ نیکی کرو۔ اجر ملے گا دوسروں کو سب کچھ دے دو۔ تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

دادا کچھ بولیں نہیں۔ وہ بھی انہیں مسخرانہ انداز میں دیکھتے رہے۔ اصفیہ کو دادا کی نظر سے انہوں نے بچا لیا۔ ایک روز سلمٰی نے ان سب کو بلایا۔ اس کے بھائی نے کوئی امتحان پاس کیا تھا۔ اس کی خوشی میں دعوت تھی۔ کلیم چچی بھی دادا کے مشورے کے مطابق ان کے ساتھ گئیں۔ وہ سلمٰی کی امی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ ادھر لان میں سلمٰی کے دوسرے دوستوں عزیزوں میں مقابلہ ہو گیا۔ لڑکے ایک طرف لڑکیاں ایک طرف۔

سلمٰی کا بھائی جس کی کامیابی کا یہ جشن تھا اور جس کے بال لہریئے دار سنہری تھے اور جس کے سر پر سلمٰی نے سفید پھولوں کا تاج پہنا دیا تھا۔ وہ اس وقت بالکل شہزادہ لگ رہا تھا۔ درمیان میں بیٹھا تان اڑانے لگا قوالی شروع ہوئی۔ ثنا حنا سب لڑکیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھی تھیں۔ لڑکیاں بے سری آوازوں میں گا رہی تھیں جبکہ لڑکے طبلے بجا رہے تھے اور شور کر رہے تھے۔ اصفیہ کلیم چچی کے پاس آگئی۔ تبھی سامنے برآمدے سے چاند آیا۔ اشارے سے اصفیہ کو بلایا۔ وہ اوپر چھت پر چلے گئے۔ چاند نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ دو ایک داؤ اصفیہ کو بتائے۔

"کیا تم اینٹیں توڑ سکتے ہو؟" اصفیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اینٹیں؟ نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی میں سیکھ رہا ہوں ہاں۔ تمہارے ہاتھ توڑ سکتا ہوں۔" اس نے نہایت پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور نیچے سے پنجہ لڑا کر موڑنا شروع کر دیا اصفیہ کی چیخ نکل گئی مگر وہ ضبط کرتی رہی۔ سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ آنکھیں بھیگ گئیں اور دانت پر دانت جما کر اس نے چاند کے منہ کی طرف دیکھا۔ اس کا سیدھے اور بھورے بالوں والا خوبصورت سر۔ اور گورے رنگ پر ہلکی بھوری مونچھیں۔ باریک باریک سی شربتی آنکھوں میں شرارت اور تیزی۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ بھی اسے گھورنے لگا۔ گرفت ہلکی ہو گئی۔

"تم فاؤل کر رہے ہو۔" اصفیہ نے آہستگی سے کہہ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

"...نہیں تو، پتہ ہے کہ وہ ڈرا کرتے ہیں کیا ہوتا ہے؟"
اس نے آنکھوں کو مسلتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی نہیں ڈری۔
"میں کرتا تو نہیں۔ تمہارے ہم زاد نے کیا تھا۔ اس نے مسکرا
دیے کہا۔ اس کی مسکراہٹ تھکی تھکی سی تھی۔ خفت و بے دلی،
مگر اصلیہ کو فرق نہیں آیا۔ "میں تمہاری طاقت آزمانا چاہتا تھا۔ تم
بہت کمزور ہو گئی ہو ہمت والی۔"
اصلیہ اپنا ہاتھ مسل رہی تھی۔ پانی لے اس کے ہاتھ کو زخمی
کے شانہ پر رکھ دیا اور سہلانے لگا۔ سرخ انگیارہ زخم نارنگ ہاتھ چاند
کے چہرے پر بہت نمایاں ہو رہی تھی۔
"ابھی ہم کھو دیں۔ فنا ہے ہو جائیں تو طاقت آ جائے
گی پھر جا سکیں۔" اصلیہ نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ اپنا ہاتھ
ہوا ہاتھ کھینچ لیا۔
"تم چھوٹی ہو!" پانی نے بے باک جرات سے اسے اوپر سے
نیچے تک دیکھا اور مطمئن لہجے میں کہا۔ "اتنی بڑی تو ہو گئی ہو!"
اصلیہ کو پھر سے کوئی بے باک دے مارا۔ اس کا رنگ سفید
ہو گیا۔ بے باک وہ مڑی اور بھاگتی ہوئی زینہ اتر گئی۔ پیچھے
اب اٹھنے سکتے جا رہے تھے۔ وہ وہاں سی نہیں رکی۔ کوئی
پکارتی رہ گئی تو اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ وہ گیٹ سے باہر نکلی
تو وہ بھی ساتھ آ گیا۔
"ہولے ہولے، سنو ستارہ! رکو۔ دیکھو۔ ارے میں نے کیا
کہہ دیا؟"
"تم پھر سے ہم زاد اور کھیتے ہو؟" اصلیہ نے مڑ کر دیکھے بغیر
کہا اور تیزی سے چلتی رہی۔
"میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ تم نے تو اس نے ایک پھر رنگ
میں اصلیہ کو آ لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تیزی سے بولنے
لگا۔ "تم اتنا ڈر کیوں مان رہی ہو۔ میں تو تمہاری بہت مدد
کر سکتا ہوں۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ مجھے بھی لگی ہو۔ اسی لیے۔"
بات ختم ہونے سے پہلے اصلیہ نے اس کے پیچھے پر زور کا
ہاتھ مارا۔ وہ لڑکھڑا کے گرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ زمین پر گر گیا۔ اصلیہ
بھاگتی ہوئی گیٹ پھلانگ کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ اس کا دل
بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس
نے وہ دکھ کی طرف جانے کے بجائے کھیر بھی کا زینہ چڑھنا شروع کر دیا۔
پھر چلا چلا کر رونے لگی۔ کہاں چوٹ لگی تھی پتہ نہیں۔ وہ بھی
نہیں جانتی تھی مگر وہ آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکی۔ بہت دیر
بعد دل ہلکا ہو گیا اور وہ غور کرنے لگی کہ اسے ہوا کیا تھا۔ مگر یہ
کوئی نہ تھا۔

ہولے نے ہر طرف تنہائی اور بھی بھی ہوا۔ وہ سیڑھیوں کی
طرف بڑھنے لگا تھا۔ ان دیواروں کے آگے ایک اور
کوٹھی تھی اور اس کے چبوترے کی بالکونی سے ہولے کی
طرف کی سمت میں ان دیواروں کے آگے سرو کے پیڑ نظر آ رہے
تھے۔ زندگی اور موت کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ اصلیہ کو کچھ نہیں آیا۔
آسمان پر چھائی ہوئی تاریکی وہ تیزی سے اوپر چڑھتے ہوئے
پار کر چکی تھی۔ اب وہ بلندی سے ساحلے کا منظر دیکھ سکتی تھی
وہ کر سکتی آگے تھا۔ جس کی چھت پر وہ ابھی ابھی ایک
خوفناک حادثے سے دوچار ہوئی تھی اور وہ اس چھت کو دیکھ سکتی
تھی۔ ہاں۔ ساحلے درختوں سے آگے۔ وہ چھت نظر آ رہی تھی۔
وہ جگہ جہاں سے وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ اسی جگہ اسے کوئی
بیٹھا تھا۔ ایک منڈیر پر لمبے چار سائے نظر آ رہے تھے۔ اچانک
خوفناک طریقے پر شاید اس نے ادھر دیکھا اور وہ ہولے نگاہ
اٹھا کر ساحلے والی ریلنگ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاں، اصلیہ کے
سائے۔
اصلیہ کی آنکھوں بھر آئیں۔ وہ روتی ہوئی پیچھے بھاگی اور
اب کھیر بھی کے صحن میں بھی دوڑ رہی تھی۔ پیچھے لان میں خوفناک
کھڑا تھا۔ ہرا بھرا سبزہ پتوں سے بھرا ہوا۔ جس کے پھول توڑ لیے
گئے تھے۔ آئندہ فصل بہار کے لیے توانائی حاصل کرنے کے لیے
وہ چپ چاپ ہولے کے پاس آ گئی۔ انہوں نے اس کے سب سے
پہلے آنے کی وجہ پوچھی۔ وہ بتا نہ سکی۔
"دل نہیں لگا رہا تھا۔ اتنے ڈھیر سارے لوگ تھے۔ گھبراہٹ
ہو رہی تھی۔"
کئی دن اس پراضمحلال طاری رہا۔ وہ کھیل میں دل لگا
تھا نہ باتوں میں۔ وہ چپ چپ صحن میں گھومتی۔ جانے کیا ہو گیا
تھا۔ کبھی اچانک وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر دیکھتی۔ کوئی نشان۔ کوئی
آنا رگی زخم کے نہ تھے۔ مگر پھر بھی وہ ہاتھ تھما رہا تھا۔ کبھی
سنسناہٹ ہی انگلیوں میں دوڑ جاتی۔ کبھی کہنی میں کچھ رینگنے
لگتا۔ پھر وہ بھی تپ جاتا۔ آنکھیں مند جاتیں۔ کیا ہو گیا
تھا اسے۔ دوائے ہی سب سے پہلے محسوس کیا۔
"گھبرا گئی ہو۔ بات کیا ہے؟" وہ شدید صدمے سے اپنے کو خود
رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔
سب کچھ بھلا سا لگتا تھا۔ مگر اس نے جبر کر کے خود کو سنبھالا۔
ایک روز دو تتلیوں، پھولوں کے ساتھ کھیل میں لگ گئی تھیں۔ سنہرے گیسو رکھ کر آسمان پر اڑتی رنگ
برنگ کی پتنگوں کو دیکھ رہے تھے۔ بے خیالی میں کچھ گنگنے لگی

آئینے تھی جانے کہاں سے ایک شناسا سی آواز کانوں میں سائے
سنائی دینے لگی تھی۔ مسکرا کر دیکھا تو وہ ہولے تھا۔ وہ
مسکرا رہا تھا۔ "کیا کہہ رہی تھی تم؟ کچھ سنا نہیں۔"
اصلیہ شرما گئی تھی۔ وہ گنگنا رہی تھی۔ اس نے سر جھٹک
دیا۔ "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔"
"کیا تم ناراض ہو مجھ سے؟"
"ہاں کر دیا۔ سب پانی بہا دیا۔"
پانی کچھ فاصلے پر تھا۔ اصلیہ نے اس کی طرف دیکھا
اب پھر اس کا ہاتھ پانی کے اندر تھا۔ مگر وہ شاید تھک
گئی تھی۔ اس نے ہاتھ باہر نکال لیا۔
"کچھ تو بہت بھی گئی ہو۔ تم سے۔ مجھے شاید تمہیں
بہت تکلیف دینی ہو گی۔ مگر تم ناراض نہ ہونا۔ تم مجھے
بہت اچھی لگی ہو۔" وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔
"ہاں، کہا تو ہے۔" اصلیہ نے بہت دھیمے سے کہا۔ "تم
پانی دے دو۔"
پانی نے ہاتھ اور بھی مضبوط ہو گئی۔ وہ اصلیہ کی
آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اصلیہ کا دل بھر آیا۔ وہ بے اختیار
ہو گئی۔
"پانی دے دو۔ نہیں تو صاف انکار کر دو۔"
گردن جھکا کر پانی نے اس کے ہاتھ سے چھین کر
وہ گنگنا بھاگی۔ مسکرا کر اپنے کرتے کے دامن سے منہ
پونچھنے لگے۔ پھر اپنے دونوں کو ان کے بازوؤں پر موڑ کر
گردن میں ڈال رہا تھا۔ اصلیہ کو ذرا سا مشکل پیش آ رہا تھا مگر
وہ ثابت قدمی سے مسکراتے ہوئے اپنی کوشش میں لگی رہی۔
پانی نے تمام چھوٹوں کی کوشش سے وہ پھیلی سیٹ پر بیٹھے
سب اصلیہ کو مبارکباد دینے لگے۔ صرف پانی خاموش رہا۔ وہ ٹرالی
کی طرف بڑھنے لگی تو پیچھے سے اس نے پکارا۔ اس نے
مڑ کر دیکھا۔
"وہ تو نہیں ہے اب۔"
"ہاں ہے۔ مگر تم اتنا تیز بھی نہ چلاؤ کہ فرشتہ اس
کے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔"
"کیا پتہ کچھ بہت دیر ہے۔" اصلیہ اپنے دل کو
بہلانے کے لیے یہ بھی بول رہی تھی۔
"ہاں ہے۔ مگر جانتی زیادہ ہے۔ مگر اب حیرانی
میں بھی نہیں رہا۔" انہوں نے کہا۔

"تم بہت تھکے دیتی آئی ہو۔" ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر منہ بنا کر انہوں نے کہا۔

"آپ کے خیال سے تیز نہ آئے ہیں۔ دیر ہو جائے تو کہیں" وہ رک گئی۔ معائنہ۔ ایکسرے۔ بینڈیج۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ انتظار گاہ میں پہنچے۔ اصفیہ بنچ پر بیٹھی ملی۔ انہیں دیکھ کر اٹھی کھڑی ہو گئی۔

"بہت دیر لگی۔ کیا ٹوٹ گیا بازو۔؟"

"تم ڈر گئی ہو۔ شاید۔"

"نہیں اتنے بہت سے مریض تھے۔ ہم انہی سے گپ شپ کرتے رہے۔ بڑا مزا آ رہا تھا۔" پھر کچھ رک کر بولی "آپ کو اب درد تو نہیں۔؟"

"نہیں۔ انہوں نے کچھ دوا لگا دی تھی اور کہا کہ گوشت اندر سے چوٹ گیا ہے۔ بڑی سمات ہے۔"

جب واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے راستے سے ہی کہا۔

"جس کی موٹر سائیکل ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔" اصفیہ سٹپٹائی۔ "کیا ضرورت ہے؟ اس نے لاپروائی سے کہا۔ "آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔"

"ارے مرد ہیں بھی کرنا ہے یا اس پر قبضہ ہی کر لیا جائے۔ دراصل میں خود جا کر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مل کی لوں گا۔ برسوں میں کسی پڑوسی سے ملاقات نہیں کرتا جانتا تک نہیں۔ کون کس گھر میں رہتا ہے۔"

اصفیہ موٹر سائیکل باہر کھڑی کی اور چابی معظم کو دے کر بھاگ آئی۔ دوا نے اس دن بیٹے کے ساتھ اصفیہ کا بھی صدقہ اتارا۔ اور اس کے کارنامے بیان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کا دل بہت نرم تھا۔ ہمدردی اور محبت سے لبالب بھرا ہوا۔ امتحان ختم ہونے کتنے ہی دن ہو گئے تھے۔ اصفیہ نے اپنے گھر جانے کا نام لیا نہ اس کے امی بلانے کا۔ دوا بے چاری کشمکش میں تھیں۔ نہ بھیجیں کیسے اور نہ بھیج کر خود کیسے رہیں گی۔

ادھر وہ بھائی کا دھچکا سہنے سے لے کر آپریشن تک پہنچا۔ اور زندہ تک پکا سیکھ گئی۔ جو بھی کوئی مہمان آتا۔ وہ بچوں میں بیٹھتی۔ ہر بار میں کچھ نہ کچھ کھاتی۔ دوا کو بھی اب اس کی خاصی عادت پڑ گئی تھی ہر کام کے لیے اسے ہی پکارتیں۔

برسات کی وہ اندھیری رات۔ بارش برس کر تھم چکی تھی پتوں کی وجہ سے سارے گھر میں سیلن ہو رہی تھی۔ برآمدے میں کھپریل۔ مینڈکوں کی بسا ندھ۔ جھینگروں کی جھائیں جھائیں اور پتنگوں کی یلغار سے دوا سخت پریشان تھیں۔ اندر اسٹور سے پھر دوائی نکالنے کو اصفیہ نے تلاشی لی تو ایک دری میں لپٹے ستار کو بھی دیکھ لیا جو دوا نے امتحان سے پہلے چھپایا تھا۔ پھینچ کھا پچ کر اسے دری سے نکالا۔ گرد جھاڑ کر تخت پر رکھا اور سُر ملانے لگی۔ معظم کسی دوست کے ہاں سے رات کو آئے۔ چھتری کونے میں رکھ کر پائدان سے جوتے رگڑتے ہوئے انہوں نے مڑ کر کہا۔

"یہ ریڈیو کہاں سے آیا؟ کون سن رہا ہے؟"

اشرفی بوا دوا کے پیر دبا رہی تھیں۔ اور ان کے پیروں کی انگلیاں چٹخا رہی تھیں مینہ پھاڑ کر ہنسیں۔ ان کے ہلتے ہوئے پانوں میں رنگے دانت بھی کپکپا گئے۔ "ریڈیو نہیں ہے میاں۔ اپنی اسپیشل بی بی ہیں۔ ستار بجا رہی ہیں۔"

معظم نے ابرو اچکا کر سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور دانت کٹکٹائے۔

"یہ شے کیا ہے۔؟" انہوں نے اپنی اماں سے سوال کیا۔

"تمہی دیکھو۔ ایک یہ لڑکی ہے۔ کونسا کام ہے جو وہ کر نہیں سکتی۔" دوا نے نصیحتوں کا پلندا کھولنا شروع کیا۔ "ارے اسے ملک سونپ دیا جائے تو ایسی حکومت کرے کہ دنیا دنگ رہ جائے۔ ایک تم ہو۔ جواں مرد۔ پڑھ لکھ کر دنیا نہیں۔ کچھ کر کے دکھایا نہیں۔ کسی کرت کے نہیں۔ سبق تو اس لڑکی سے، نہ اسے ڈھنگ کی تربیت ملی نہ تعلیم۔ مگر کوئی کام اس کے لیے مشکل نہیں۔ لے میرے مولا۔ تیری دین کے قربان جاؤں۔ ایک اٹھا دیا۔ سو گندا۔ نہ میرے کام کا نہ کسی اور کے۔"

وہ بڑبڑاتی رہیں اور ان کے دل پر بوجھ بڑھتا رہا۔ صحن میں مینڈکوں کا راج تھا۔ جن کے بینڈ باجے ساری رات بجتے تھے۔ اور ہر بارش کی رات برات اترتی تھی۔ جس میں جھینگروں کے الاپ اور بھنگوں پتنگوں کے رقص ہوتے اور پہلے سڑی مچھلی جیسی بساند سونے پر سہاگہ۔ دماغ ویسے ہی بھنبھنا رہتا۔ اوپر سے معظم جی جلانے کو کوئی نہ کوئی قصہ نکال بیٹھتے۔

کمرہ چھوٹا اور سامان سے اٹا اٹ بھرا۔ ہلکے بلب کی روشنی میں ستار کے تار بھی ٹھیک سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ مچھروں اور بھنگوں کے حملوں سے بے نیاز ستار پر جھکی ہوئی تھی کہ سامنے سے ایک لمبا سایہ آ کر ٹھہر گیا۔ وہ ڈر گئی۔

"بالکل غلط سلط بجا رہی ہو تم۔ آتا جاتا ہے نہیں۔" معظم نے بہت چڑ کر کہا تھا۔

"اتنا اندھیرا جو ہے۔ کچھ نظر بھی آ رہا ہے بھلا۔"

خاموش رہنا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ لاجواب کر دینے میں کمال حاصل تھا۔

صبح برستی بارش میں سپڑ سپڑ کرتی شاہین پھپھو اشرفی کے ساتھ آئیں۔ دوا کے کمر میں درد تھا۔ وہ کراہتی ہوئی اٹھیں ہنکے سے اشارے سے اشرفی کو جلانے کا کہا اور راز دار بیٹی سے یوں مخاطب ہوئیں۔

"رات کو ڈھائی بجے تک برآمدے میں بیٹھے ستار بجاتے رہے۔ تمہارے بھیّن صاحب۔ مچھر اور بھنگے تھے کہ الٰہی توبہ۔ ادھر جھینگر اور مینڈک۔ سب مل کر ستار کے ساتھ دھنیں اڑا رہے تھے۔ سنا تم نے۔ دن بھر جانے کہاں۔ واہی تواہی پھرتے ہیں۔ ماں سے مطلب نہ گھر سے دل چسپی۔ رات کو مجھے بے چین کرنے کو لے بیٹھے ستار۔ ارے میری اسے پروا کب ہے۔ مروں کہ جیوں۔ دن کو پیٹھ لگانے کی مہلت نہیں ملتی مجھے، رات کو صاحبزادے نیند حرام کرتے رہے۔"

"تو اماں۔ آپ کیوں جاگتی رہیں۔ سو جاتیں۔ ستار کی آواز تو اور بھی لوری کا کام دیتی ہے۔" شاہین بہت صبر سے دوا کے شکوے سن رہی تھیں۔ انھیں سمجھانے لگیں۔ "اگر طبیعت خراب تھی تو معظم سے کہہ دیتیں۔ اب اتنا بے حس بھی نہیں ہے وہ۔"

"ارے بیٹی۔ میں تو جاگتی رہی اس لڑکی کی وجہ سے۔ تو دیکھو بھلا۔ ساری رات اس نے برآمدے میں ہی گذار دی معظم ستار بجاتے رہے۔ یہ سنتی رہی۔ جب میں پکارتی۔ کہہ دیتی دوا آپ سو جائیں۔ ہم ستار سن رہے ہیں۔ سیکھ رہے ہیں۔ میں کیسے سو جاتی پرائی لڑکی کی ذمہ داری۔ اب تم ہی اسے سمجھا دو۔ میں تو کلام کروں گی نہیں۔ بہت تھک گئی ہوں۔ اب جتنے دن میاں صاحبزادے باہر رہتے ہیں میں چین سے رہتی ہوں۔ اب آگئے میرا کلیجہ پھونکنے۔" وہ تھک کر بستر پر گر گئیں۔

شاہین نے اصفیہ سے پوچھا کہ وہ کیوں اتنی رات گئے تک جاگتی رہی۔ اصفیہ نے سادگی سے کہا۔

"ارے پھپھو۔ اتنا مزیدار موسم تھا۔ بارش کی پھوار جب برآمدے میں آ کر گرتی۔ کپڑے بھیگ جاتے۔ اتنا مزہ آتا اور چھوٹے چچا ستار کتنا اچھا بجاتے ہیں۔ اللہ بس جی چاہتا تھا وہ بجائے جائیں اور بارش برستی رہے اور ہم سنتے رہیں۔"

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

★ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے،
★ نئے بال اُگاتا ہے
★ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
★ مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے یکساں مفید
★ ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"سوہنی ہیئر آئل" 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہٰذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے۔ ایک شیشی کی قیمت صرف /60 روپے ہے دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوا لیں۔ رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

ایک شیشی کے لیے ___/80 روپے
2 شیشیوں کے لیے ___/140 روپے
3 شیشیوں کے لیے ___/210 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں منی آرڈر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ سیکنڈ فلور ایم اے جناح روڈ کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان پتوں سے حاصل کریں

• بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ سیکنڈ فلور ایم اے جناح روڈ، کراچی
• مکتبۂ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی فون نمبر 7735021

"ادھر تمہاری وجہ سے اماں جاگتی رہیں۔ کچھ پتہ ہے ان کی طبیعت کتنی خراب تھی۔ تمہارے خیال سے وہ سو بھی نہیں سکیں۔"

"ہماری وجہ سے!" اصفیہ ہنس دی۔ "ارے نہیں بھیجو وہ تو مجھ انہیں تنگ کر رہے تھے۔ پھر ہم نے ان کے پلنگ پر مچھر دانی لگا دی تھی۔"

شاہین اسے بتا سکیں۔ مچھر دانی کے باوجود وہ نیند سے محروم رہیں۔

شاہین پھپھو کی بیٹی اسماء کی منگنی تھی۔ گھر کے تمام لوگ صبح سے ہی چلے گئے تھے۔ دادا کی طبیعت خراب تھی اس لیے وہ نہیں گئیں۔ اصفیہ بھی ان کی وجہ سے نہیں گئی۔ مگر شام کو دادا نے زبردستی اسے اشرفی کے ساتھ بھیجا۔ وہاں بہت لوگ تھے۔ اس قدر شور شرابا، گانا بجانا، ڈانس، ایک اسٹیج بنایا گیا تھا جہاں بے حد روشنی تھی اور صوفوں کے نیچے سبز نیلے بلب لگائے گئے تھے۔ جس کی ہلکی خوابناک روشنی اسٹیج پر بچھے سفید قالین کو قوس قزح کی طرح چمکا رہی تھی۔ صوفے پر اسماء کو لا کر بٹھایا گیا۔

اُف کس قدر حسین لگ رہی تھی اسماء۔ کہاں وہ شریر اور شوخ و شنگ لڑکی۔ کہاں یہ شرمائی لجائی نظریں نیچی کیے سنہری دوپٹے پر جگمگ ستاروں اور کرن کے ہالے میں لو دیتا ہوا گلابی چہرہ جیسے کہکشاں کے بیچ میں چاند۔ مگر اسی وقت روشنی کا جھماکا ہوا اور اصفیہ کی تصویر اتار لی گئی تھی۔

"ہائے اللہ چھوٹے چچا! آپ نے اصفیہ کا کس انداز میں فوٹو لیا۔ بتا دیتے تو وہ منہ بند کر لیتی۔"

"آنکھیں بھی تو پھٹی ہوئی تھیں۔ اب تصویر آئے گی تو دیکھنا۔" جمیلہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "سب آنا مذاق اڑائیں گے۔"

معظم نے اس کے پاس آ کر کہا۔ "تصویر چاہے جیسی ہو، یادگار ہوگی۔ لیکن عام حالات میں تم ایسی نظر نہیں آتیں۔ حالانکہ یوں تو آج خاصی سج رہی ہو۔"

اصفیہ کو غصہ آ رہا تھا۔ اس نے سب کی طرف دیکھا۔ سب ہی اس کا مذاق اڑانے کے موڈ میں تھے۔ یا کوئی متوجہ نہیں تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ اشرفی بوا کو ساتھ لیا اور پیدل گھر کی طرف چلی۔ سڑک پر جگہ جگہ کیچڑ ہو رہی تھی۔ شلوار کے پائنچے اوپر کیے، سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی وہ گھر میں آئی۔ صحن میں اندھیرا تھا۔ اندر بھی گھپ۔ وہ ڈر گئی۔ اشرفی بوا واپس جانے لگیں۔ انہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اب واپس منگنی کی تقریب میں جا رہی تھیں۔ کمرے میں روشنی کر کے اس نے دیکھا دادا بالکل سیدھے لیٹے ہیں۔ آنکھیں بند اور ساکت۔ وہ الٹے قدموں بھاگی۔ اشرفی بوا صحن میں پہنچی تھیں کہ اس نے آواز دی اور انہیں پکڑ کر کھینچنے لگی۔ "اشرفی بوا! ہمارا خیال ہے دادا مر گئے۔"

اشرفی فوراً کمرے میں آئیں۔ دادا کو ٹٹولا۔ آوازیں دیں۔ تب انہوں نے کہا۔ "ہوں۔ ہوں۔ کیا ہے؟" اور کروٹ لے کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ اشرفی نے اصفیہ کو گھورا۔ ملامت اور افسوس کے ساتھ۔

"کیا ہے اشرفی۔ کیا سب آ گئے؟"

"نہیں بیگم۔ اسپیشل بی بی آئی ہیں انہیں لے کر آئی ہوں۔ آپ نے روشنی بھی نہیں کی۔ کتنا اندھیرا تھا!"

"ہاں اشرفی! بہت اندھیرا تھا۔ بہت اندھیرا ہے۔" دادا نے عجیب لہجے میں آہستہ سے کہا۔ اشرفی نے صحن کا بلب روشن کیا اور چلی گئی۔ اصفیہ نے کمرے میں جا کر کپڑے بدلے۔ کچن میں جا کر دادا کی روٹی تھن لگا کر کھائی۔ برآمدے میں آئی تو دادا نے پوچھا۔

"کون؟ اشرفی، گئی نہیں؟"

"یہ ہم ہیں دادا!"

"کیا کر رہی ہو؟"

"کھانا کھا رہے تھے؟"

"کیوں؟ وہاں منگنی میں کیا کھانا نہیں تھا۔ آ کیوں گئیں؟"

"بس دل نہیں چاہ رہا تھا۔ یہاں آنے کو دل چاہا آ گئے۔ آپ نہیں تھیں دادا تو دل لگا نہیں۔ آپ نے کچھ کھایا؟"

وہ خلاف معمول چپ رہیں۔ کچھ بولیں نہیں۔ انہوں نے اسے نماز کی تلقین بھی نہیں کی۔ روزانہ کا مخصوص جملہ۔ "اب سو جاؤ۔" بھی نہیں کہا۔ اصفیہ لیٹ گئی۔ مگر اس کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ کیسے دل کو سمجھائے۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا۔ بس وہی چاند کے ہالے کانوں میں سنہارس پٹکاتے۔ اس کا چہرہ۔ اس کی باتیں۔ وہ کیا کرے۔ کیا کرے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔

عجیب عجیب خیالات ذہن میں اودھم مچانے لگے۔ تکیے میں منہ چھپا کر وہ رونے لگی۔ بال گرج رہے تھے۔ اس کا دل بھی رو رہا تھا۔ آنکھیں برس رہی تھیں۔ بارش خوب زور سے ہونے لگی۔ بجلی کی چمک اور کڑک کے علاوہ بھی کوئی ایسی آواز تھی جس کی خلش نے اصفیہ کو جگا دیا۔ وہ غور سے سننے کی کوشش

کر رہی تھی۔ قریب سے ہی کوئی آواز آ رہی تھی۔ وہ ڈر گئی اور اپنے کمرے دادا کے بستر پر جا گری۔ اور فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا آواز دادا کے پاس سے ہی آ رہی تھی۔ وہ رو رہی تھیں۔ دبی دبی گھٹی ہوئی سسکیاں۔ آنسوؤں سے دادا کا تکیہ تر ہو رہا تھا۔ اصفیہ ان سے لپٹ گئی۔ پیار کرنے لگی۔

"دادا، دادا! کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہیں آپ۔ کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"اپنے نصیب کو رو رہی ہوں بیٹی!" انہوں نے آہستہ سے کہا۔ وہ کبھی روتی نہیں تھیں۔ ہمیشہ دوسروں کے دکھ سمیٹتی تھیں۔ ہر کسی کے ساتھ ہمدردی کرتی تھیں۔ کسی کو رنجیدہ و پریشان دیکھتیں فوراً تسلی تشفی کرتیں۔ جانے کیا دکھ تھا انہیں برسات کی اس اندھیری رات میں آنسوؤں کا سیلاب ان کے تکیے تک ہی محدود تھا مگر دل پر کیا چوٹ لگی کہ یوں بے قرار ہو کر رو رہی ہیں۔ اصفیہ نے ان کا سر دبایا۔ انہیں سہلاتی رہی۔ تسلی دیتی رہی۔ تب دادا کے دل کا درد اس کی محبت و ہمدردی کے سامنے بہہ نکلا۔ انہوں نے اپنے دل کا داغ کھول کر رکھ دیا۔ وہ داغ جو معظم کے ہاتھوں لگا تھا جو طرح طرح ان کی زبان، ان کے عمل سے لگتا ہی رہتا تھا اس پر انہوں نے کبھی کبھار مرہم بھی رکھا مگر زیادہ تر اسے کریدتے رہے۔ اسے زخم کی صورت دے کر نشتر لگاتے رہے۔

صفی اللہ، معین، کلیم جو ان کے اپنے خونِ جگر کا حصہ نہ تھے ان کے پالے ہوئے تھے۔ کبھی بھی ان کے سامنے سر اٹھا کر ان کے فیصلوں کے خلاف سینہ سپر نہ ہوئے۔ یہ معظم ہی ہے جو ان کی نافرمانی کرتا ہے ان کے کسی فعل کو سراہتا نہیں۔ ان کی کسی خواہش کو پورا نہیں کرتا۔ ان کے فیصلوں پر معترض رہتا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد انہوں نے اس گھر کے شیرازے کو کس طرح سمیٹا۔ کس طرح اپنی محبتوں کو لٹایا۔ معین کے دل کو مٹھی میں لینے کے لیے گھر کا سب سے بڑا حصہ انہیں دیا۔ اور خود سب سے چھوٹے، سب سے بوسیدہ حصے میں اپنا ٹھکانہ بنایا کسی کو ان سے شکایت نہ ہو۔ ان پر کوئی الزام نہ آئے۔ اسی لیے انہوں نے گھر کے بٹوارے میں سب کے حقوق کا خیال رکھا۔ گو کہ معین نے اپنے حصے کے لیے ان کی مہربانی پر تنقید کی تھی اسی لیے دو کمرے اپنے گھر میں معظم کے لیے وقف کر دیے۔

معین کو احساس تھا کہ اماں نے اپنے لیے جو گھر کا حصہ منتخب کیا ہے وہ ناکافی ہے۔ معظم کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ اور معظم کو اب بھی یہی اعتراض ہے اماں نے جو حصہ لیا وہ اس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ گھر کا پھر سے بٹوارہ ہو۔ سب کو برابر کا حصہ ملے۔ تقسیم حق کی بنیاد پر ہو نہ کہ

افتادِ مزاج کے مطابق۔ کسی سے محبت زیادہ ہے تو اسے زیادہ حصہ کیوں ملے اور کسی سے محبت کم یا اس کی اہمیت نہیں تو اسے کس لیے نقصان میں رکھا جائے۔ ایک باپ کی اولاد میں تفریق کیوں۔ اس لیے بھی کہ معین کے گھر میں جو کمرے معظم کے حصے میں آئے ان پر نام تو معین کا ہے۔ انہوں نے برائے نام یا فی سبیل اللہ احسان کیا ہے۔ اور یہ احسان معظم کو منظور نہیں۔

جب اسے اپنے ہی گھر میں رہنے کے لیے دوسروں کے مزاج کا پابند ہونا پڑے تو وہ صدائے احتجاج کیوں بلند کرے۔ منجھلے بھیا جب غصے میں ہوتے ہیں، چنگھاڑتے ہیں، ان کی ناراض آوازیں آرام اور نیند میں مخل ڈالتی ہیں۔ معظم کو اعتراض ہوتا مگر جب اس کے دوست آتے ہیں۔ ہنستے بولتے ہیں یا زور سے قہقہہ لگاتے ہیں تو منجھلے بھیا کو اعتراض ہوتا ہے اس لیے تاکہ انہوں نے اپنے مکان میں سے دو کمرے اسے دیے ہیں۔ لہٰذا وہ کسی بھائی کی خیرات کیوں لے۔ کسی کی عنایتوں کا بوجھ کیوں اٹھائے۔ اماں کے حصے میں نہ کوئی دروازہ باہر کی سمت کھلتا ہے۔ نہ وہاں لان ہے۔ نہ ہی کمرے اس قابل ہیں کہ ان میں مرضی کے مطابق دوستوں کو بلا کر بٹھائے۔ گھر کا یہ حصہ جو دادا کے ملازمین کے لیے وقف تھا اس کے حصے میں کیوں ہے۔ سب بیٹھ کر فیصلہ کریں اور برابر کی تقسیم ہو۔

اس کے دماغ میں بچپن سے ہی احساس سما گیا ہے کہ اسے کوئی نہیں چاہتا۔ اس کی گھر میں کوئی اہمیت نہیں۔ بڑے بھائی چاہتے تھے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ کوئی مناسب کام کرے۔ تجارت، کاروبار کچھ بھی کرے۔ اپنا مستقبل بنائے مگر وہ ضد میں وہی کرتا۔ اسی راستے پر چلتا جو اسے پستی کی طرف لے جاتا رہا۔ میں چاہتی تھی میرا بیٹا پڑھ لکھ کر افسر بنے۔ اس کا نام ہو۔ وہ بے ماں کے بچے جن کو میں نے تعلیم و تربیت کے ذریعے ہوش و آگہی کی منزل دکھائی میرا اپنا بیٹا بے عمل رہا۔ میں نے جو کوشش جو قربانیاں سب کے لیے دی تھیں ان کو یہ مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ مجھے تو اس سے یہ توقع بھی نہیں کہ مرتے دم اس کے ہاتھ سے پانی کے قطرے نصیب ہوں گے ایک بیٹی ہے اسی سے اپنا دکھ درد کہتی ہوں۔ وہ اپنے گھر بار کی۔ سُن کر چُپ ہو جاتی ہے۔ میرا کوئی نہیں۔ میرا دکھ بانٹنے والا۔ میری اذیتوں کو کم کرنے والا مجھے سہارا دینے والا کوئی نہیں۔"

دادا پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ اصفیہ بوکھلا گئی۔ یہ شاہین پھپھو ہی وہ لگاتار خیال کرتی ہیں۔ اپنے گھر بار کی میں تو کیا۔ ان کا کوئی فرض ہی نہیں۔ وہاں بیٹی کی منگنی میں سارا گھر گیا تھا۔ وہ اکیلی رہ گئیں۔ شاہین پھپھو چاہتیں تو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی تھیں۔

مگر انہیں بھی دوا کا اتنا خیال نہیں۔ بے چاری دوا۔

"آپ نے کھانا کھایا دوا؟"

وہ ہنس کر ان سے پوچھنے لگی۔ اس کی موٹی عقل میں ان کے درد کا درماں بھوک کا ازالہ نظر آیا۔ دوا نے آنسو خشک کر کے کہا۔

"بیٹی! بھوک ہی نہیں۔ اکیلی پڑی سوچتی رہی۔ کیوں زندہ ہوں۔ کس کے لیے جی رہی ہوں۔ کس کو ضرورت ہے میری۔ پیار پانچ سو۔ ایک عورت۔ پال پوس کر اتنا بڑا کر دیا۔ اپنی جوانی ان کے نام۔ ان کی آسائشوں پر قربان کر دی۔ اپنے لیے کچھ نہ رکھا۔"

اصفیہ دوا سے لپٹ کر انہیں یقین دلاتی رہی کہ اور کوئی ہو نہ ہو وہ انہی کی ہے۔ انہی کے پاس رہے گی۔ ان کی خدمت کرے گی۔ ان کے سارے حکم مانے گی۔ دوا اس کے بھولے پن پر مسکرا دیں۔ انہیں دوسروں سے توجہ ملتی ہی رہتی تھی۔ اپنوں کے دامن ہی خالی تھے۔

صبح بارش رک گئی تھی۔ چم چم سورج چمک رہا تھا۔ سنہری دھوپ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں پیڑوں کے پتے دھل کر شفاف ہو گئے تھے۔ سارا ماحول ہی دھلا دھلایا نکھرا نکھرا ہو گیا تھا۔ پتوں پر بارش کے قطرے ابھی تک کہیں کہیں چپکے ہوئے تھے اور دھوپ میں چمک رہے تھے۔ شاخیں جھوم رہی تھیں۔ پھول مسکرا رہے تھے۔ پتے تالیاں بجا رہے تھے۔ کچا صحن تالاب بنا ہوا تھا۔ اصفیہ تو اس میں قدم دھرتے ڈرتی تھی۔ کہیں پھسل کر گری تو ناشتا بن جائے گا۔ اشرفی بوا کی رشیوں نے دیوار کے ساتھ دو دو اینٹوں کی بٹیا سی بنا دی تھی جو شاور بیٹھے تک جاتی تھی۔ وہ اسی پر سنبھل سنبھل کر قدم دھرتی آجا رہی تھیں۔ اصفیہ انہی کے نقش قدم پر چلنے کی سوچ رہی تھی کہ نفیسہ کے کمرے سے چھوٹے چچا کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ پھر اپنی ماں سے جھگڑ رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ اتنے لڑاکو کیوں ہیں۔ جب آتے ہیں کسی نہ کسی بات پر جھگڑتے رہتے ہیں۔ اصفیہ دوا کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

"اتنی مشکل سے بھیا نے کچھ کمایا ہوتا تو اپنا دل بھی نکال کر انہیں دے دیتیں۔ میرے لیے ہی تو ہر کا گولہ بن جاتی ہیں۔"

"ان کے لیے کچھ کرتی ہوں تو کسی امید کسی توقع پر۔ وہ میری امیدوں خیال میں نہیں ملتے۔ ساتھ نے وہ بھی گزر ہوئی تھیں۔ میرے لیے کچھ کیا ہوتا تو میں بھی آپ کی امیدوں پر پورا اترتا۔ مجھے آپ نے کیا دیا۔ میرے لیے تو آپ کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور تو کیا دیتیں۔ سادی جائیداد، توجہ، اپنی ذات تو آپ نے بڑے بھیا منجھلے بھیا، چھوٹے بھیا اور اشفاق بھائی کے لیے وقف کر دی تھی۔ میرے لیے بچا ہی کیا تھا صرف ڈانٹ پھٹکار۔"

معظم کے کہجے میں محرومیوں کی داستان تھی۔ آواز میں ایک درد تھکن۔

"ان کے لیے جو کچھ کیا وہ تیرے باپ کی خواہش اور تمنا پر۔ ارے کچھ سوچ۔ ان کی ماں نہیں تھی۔ اس لیے انہیں صرف محبت اور توجہ دی۔ تو تو میرا اپنا تھا میری ساری ممتا تیرے لیے ہی تو تھی۔ انہیں سب کچھ دے دیا۔ اپنے لیے تجھے ہی بچا کر رکھا کہ تو میرا فخر، میرا غرور ہے۔ پر جانتی نہ تھی۔ تو ہی میرے فخر کو خاک میں ملائے گا۔ میری آرزوؤں کا قاتل بنے گا۔"

"دوسروں نے آپ کی سب آرزوئیں پوری کر دی ہیں۔" وہ بہت پست لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "ان کی زندگی کے مقاصد ہیں۔ وہ آپ کے سامنے، ساری دنیا کے سامنے سرخرو ہیں۔ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ کسی کو مجھ سے محبت نہیں، توقع نہیں۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ لے دے کے ایک ماں ہے، سو وہ بھی بٹی ہوئی۔ تقسیم شدہ۔" اچانک ان کا لہجہ بدل گیا، آواز بلند ہو گئی۔ چلا کر کہہ رہے تھے۔

"نہیں چاہیے مجھے ایسی ادھوری ماں۔ سالم ماں چاہیے مجھے۔ میری اپنی، سالم ماں۔ جس کے دل میں صرف میری چاہت ہو۔ میری محبت۔ میرا اور وہو۔ جس کے سینے پر میرا نام لکھا ہو۔"

آخری جملہ کہتے کہتے تیزی ختم ہو گئی۔ جیسے کسی کرب نے انہیں جھکا دیا۔

"چلا جا یہاں سے۔" دوا جانے کیوں چلانے لگیں۔ "صبر کر لوں گا میں۔ بہت طاقت بہت حوصلہ ہے ابھی مجھ میں۔ نہیں چاہیے تیرا نام تیری محبت مجھے۔ میرے چاہنے والے بہت۔"

دونوں زور زور سے رو رہی تھیں۔ اندر پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا۔ اصفیہ کے گلے میں گولہ سا اٹک گیا۔ وہ چوکھٹ سے سر لگا کر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔ تبھی بہت تیزی سے معظم باہر آئے۔ اسے دیکھ کر رک گئے۔

"اچھا۔ تو آپ ہیں۔ جائیے جائیے۔ اماں کی دلداری کیجیے۔ بہت کچھ چھین لیا ہے میرا آپ نے بھی۔ بہت کچھ کہہ کر وہ باہر کو چل دیے۔

اصفیہ اندر جا کر دوا سے لپٹ گئی۔ دونوں گلے مل کر رونے لگیں۔ پھر دوا نے اسے اپٹا لیا۔ آنسو پونچھے اور تسلی دی۔ "اے تجھے کیا ہوا پگلی۔ یہاں تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ تو کیوں دکھی ہوتی ہے۔ میرے تو نصیب ہی ایسے ہیں۔"

دن بہت پھیکے گزر رہے تھے۔ دوا چپ چپ رہتیں معظم آتے وہ بھی خاموش رہتے۔ گھر پر اداسی کا راج تھا۔ ابا کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا کچھ دن کے لیے آجاؤ۔ مگر تعلیم کا حرج نہ ہو۔ دادی سے پوچھ کر لکھو۔ میں آکر لے جاؤں گا۔" اصفیہ سوچ میں پڑ گئی۔ ادھر دوا اداس اور کچھ بیمار۔ اس نے لکھ دیا "ابا ابھی تو دادی کی طبیعت خراب ہے۔ وہ ذرا ٹھیک ہو جائیں پھر وہ خود آپ کو لکھ دیں گی۔"

اس دن کوئی بارات سڑک سے گزر رہی تھی۔ کلیم چچی نے اُسے بلایا۔ بینڈ باجہ بھی تھا اور لوگ دولھا کی کار کے آگے ڈانس کرتے جا رہے تھے۔ سب لڑکیاں کلیم چچی کی سب سے اوپر والی چھت پر کھڑی سڑک سے گزرتی بارات دیکھ رہی تھیں۔ اصفیہ نظریں گاڑے سرو کے پیڑوں والے گھر کی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے ریلنگ سے ٹکا ایک سیدھے بھورے بالوں والا سر، نیلی قمیص اور سفید پتلون۔ اس کا سراپا بھی کیا دلکش تھا۔ دور سے اور نزدیک سے ہر طرح آنکھوں میں کھب جانے والا۔ شاید اب اس نے جوڈو کراٹے کا کورس کر لیا ہو۔ اس وقت بھی اس میں کتنی طاقت تھی۔ اصفیہ نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔ غور سے دیکھا۔ نہیں کوئی نشان نہیں، کوئی آثار نہیں۔ وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ شاید بارات دیکھنے آیا تھا۔ مگر سامنے ہی کئی لڑکیوں کے جھرمٹ میں کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ اصفیہ چپکے سے نیچے آگئی۔ دوا نے پوچھا۔

"دیکھ آئیں بارات؟"

"نہیں دوا۔ مزا نہیں آیا۔"

اس نے بے خیالی میں کہہ دیا۔ دوا خفا ہونے لگیں۔ لڑکیوں کی طرح تمہیں کسی بات کا شوق نہیں۔ کوئی ولولہ نہیں۔ کسی بات میں مزا نہیں آتا۔ آخر ایسا کیوں۔ پہلے تو لڑکوں کے ساتھ ہی دھینگا مشتی کرتی تھیں۔ بندروں جیسی حرکتیں۔ لڑکوں والے کھیل۔ اب ہنستیں تک نہیں۔ ہو کیا گیا ہے تمہیں۔"

وہ بتا نہیں سکی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ کیوں کسی بات میں دل نہیں لگتا۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اوٹ پٹانگ خواب آتے ہیں۔ وہ جوڈو کراٹے کی مشق کر رہی ہے۔ ہواؤں میں چھلانگیں لگا رہی ہے۔ چاند تک پہنچنا چاہتی ہے اور زمین اسے نیچے بلاتی ہے۔

دن مضطرب، بے کل اور اداس تھے۔ پھر ایک روز معظم نے دوا سے کچھ جھگڑا کیا اور اسی کے دو دن بعد منجھلے چچا عین دوپہر کو دوا کے پاس آئے۔ صبح اور دوپہر کو جب سب دوا کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ منجھلے چچا دن کے کسی بھی حصے میں نہیں آتے تھے۔ دو دن سے دوا کی طبیعت بہت خراب تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹی رہتی تھیں۔ منجھلے چچا ان کے پلنگ کی پٹی پر آکر ٹک گئے۔

"اماں بی!" انہوں نے نہایت مضبوط اور گمبھیر لہجے میں بات شروع کی۔ "میں جانتا ہوں۔ آپ نے مجھے سب سے بڑھ کر چاہا ہے۔ سب کچھ دے دیا ہے۔ پیار، محبت، توجہ اور وقت۔ آپ نے مجھے گھر کا بھی سب سے بڑا حصہ دے دیا اسی لیے میں نے اپنے گھر کے دو کمرے معظم کو دے دیے۔ وہ ہم میں سے ہی ہے۔ ہمارا ہی ہے۔ اس کی حق تلفی ہو یہ تو میں نہیں چاہتا۔ میں نے سنا ہے اسے ملال ہے کہ آپ نے مجھے میرے حق سے زیادہ حصہ دے دیا۔ اماں بی آپ نے جو کچھ ہمارے لیے کیا ہے۔ جو کچھ بھی دیا ہے اس کا بوجھ، اس کا احسان ہم زندگی بھر اتار نہیں سکتے۔ یہ گھر یہ زمین یہ تو چار روزہ ہے۔ آپ نے ہمیں سب کچھ دے دیا۔ ہم کچھ نہ دے سکے۔ کچھ نہ کر سکے۔ مگر معظم کو بتا دیجیے اماں بی۔ محبت تقسیم نہیں کی جاتی۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ نہیں، محبت تو سمندر ہے جس کے کنارے کبھی نہیں ملتے۔ وہ سب کے لیے ہے۔ اور آپ ہی وہ سمندر ہیں جس کی تہہ سے سب کو موتیوں کے تحفے ملتے رہتے ہیں۔ معظم اس سے محروم کیوں رہے۔ میں نے۔ میں نے اپنا گھر معظم کے نام کر دیا ہے۔ یہ کاغذات اسے دے دیجیے۔"

انہوں نے بہت نرم آواز میں بات پوری کی۔ کاغذات کا پلندہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دوا اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ گھبرا گئیں۔ بولیں "معین! یہ تم نے کیا کیا۔ میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میرے پاس تھا ہی کیا۔ خالی خولی محبت اور ہمدردی۔ مگر میں نے تمہارے باپ سے کیے وعدے اور ان کے اعتماد کے لیے جو کچھ کیا اس کے لیے میرا رواں رواں بھی کام آجاتا تو مجھے ملال نہ ہوتا بیٹے! معظم پاگل ہے۔ سمندر سے سبھی کو موتی نہیں ملتے۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو سمندر کی تہہ سے موتی نکالتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں۔ جدوجہد کرتے ہیں تب ان کو ان کی محنت کا ثمر ملتا ہے۔ معظم ان میں سے نہیں ہے۔ تم اس کی فکر کیوں کرتے ہو؟"

معین چچا نے جھک کر دوا کے دونوں ہاتھ اپنے تو انا ہاتھوں میں تھام لیے۔ انہیں اپنے ہونٹوں سے لگایا۔

"میں آپ کو معظم کی فکر سے آزاد کرنا چاہتا ہوں۔ اماں بی جب آپ نے گھر کے حصے کیے تھے تب بھی میں نے بڑے بھیا سے کہا تھا کہ سب سے چھوٹا اور بوسیدہ حصہ اماں کے لیے کیوں

منتخب کیا گیا۔ آپ نے اس وقت کہا تھا۔ تم لوگوں کو گنجائش والا گھر چاہیے۔ معظم کسی قابل ہوگا تو اسی کو درست کرائے گا میرے لیے یہ کافی ہے اور جہاں میں ہوں وہیں تو تم سب ہو گے۔ میں چپ ہوگیا اور اپنے دونوں باہر نکلنے والے کمرے معظم کو دے دیے۔ اب اسے اگر کوئی شکایت ہے تو اسے رفع ہو جانا چاہیے۔ آماں بی! میرا گھر اب معظم کا ہے اور میں آپ کے پاس شفٹ ہو رہا ہوں۔ کہیے منظور ہے یہ فیصلہ آپ کو؟"

دوا کے آنسو آبشار کی طرح ان کے چہرے پر بہنے لگے۔ سسکیاں لیتے ہوئے انہوں نے معین چچا کو لپٹا لیا اور ان کی گردن پر بوسے دینے لگیں۔ معین چچا کے چہرے پر خوشی بڑھتی جا رہی تھی۔ غصے کی نہیں، شدت جذبات اور احساس کی سرشاری۔ انہوں نے دوا کے آنسو پونچھتے ہوئے انہیں پیار سے سمجھایا۔

"آپ روتی کیوں ہیں؟ ہم تو آپ کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ ہم آپ کی صحیح خدمت نہیں کر سکے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ معظم کو آپ سے بھی شکایتیں ہیں۔ آپ نے اس سے بڑھ کر ہم سب کو چاہا۔ مگر اس کی سوچ کا انداز ہم سے الگ ہے۔ شاید اس لیے کہ ہم نے اس کی ماں اس سے چھین لی۔ اس کا حق بھی اسے نہ دیا۔ خیر اب بھی وقت ہے۔ میں اپنی کوتاہیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ آماں بی! آپ کی بہو، پوتے پوتیاں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ آپ انہیں قدموں میں جگہ دیں گی نا؟"

دوا جلبلا کر رو دیں۔ "دوں گی۔ دوں گی کیوں نہیں۔ میرا گھر میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ آج میں سرخرو ہوگئی لے اللہ!"

تبھی منجھلی چچی، فنا، حنا، رجب اور عزت دوا کے پلنگ پر پروانوں کی طرح جمع ہوگئے اور باری باری دوا سے لپٹ کر آنسو بہانے لگے۔ پلنگ کی چولی اتنے لوگوں کا بوجھ نہ سہار سکی اور ایک زوردار آواز کے ساتھ ٹوٹ کر زمین سے جا لگی۔ رجب ڈھک کر پیچھے گرا۔ فنا ٹانگ کراؤنڈی ہوگئی۔ منجھلی چچی اور دوا درمیان میں دھنسی رہ گئیں۔ اچانک سب ہنسنے لگے۔ آنسوؤں کی برسات میں قہقہوں کی بارش ہونے لگی۔ خوشی کی کرنیں پھوٹ پڑیں۔ منجھلے چچا سنجیدگی سے بولے۔

"زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو یہی ہوتا ہے۔ آماں بی کے بوجھ کو اب ہم سب بانٹ لیں گے۔ اب معظم ہماری ذمہ داری ہے۔ میں اپنا حصہ اسے دے کر اپنے حصے میں معظم کو لے رہا ہوں۔ آماں بی منظور ہے؟"

دوا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ان کی بیماری تو فوراً غائب ہوگئی اور ایسی طاقت ان میں آگئی کہ خود باورچی خانے میں جا کر اشرفی کو منجھلے چچا کے پسندیدہ کھانے پکانے کی ہدایتیں دینے لگیں۔ اصفیہ فنا، حنا کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ جسے دوا اسٹور اور اصفیہ کا کمرہ کہتی تھیں۔ گو وہ اس میں ٹکتی نہ تھی۔ رجب اور عزت برآمدے میں بستے کھول کر بیٹھ گئے۔ بڑے چچا، کلیم چچا اور ان کی پوری فیملی جمع ہوگئی۔ شام کو شاہین چھپھو بھی آگئیں۔ گھر میں ایسا ہنگامہ تھا جیسے کوئی تقریب ہو۔ رات دیر تک معظم کا انتظار کرنے کے بعد سب نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے۔ بہت رات گئے معظم آیا۔ دوا اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے پاس آکر پوچھا۔

"کچھ کھانے کو ہے یا دیر سے آنے کے جرمانے میں بھوکی؟"

اصفیہ کی آنکھ نکل گئی تھی۔ اس نے کھانا لا کر دیا۔ دوا کے پلنگ پر بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا۔ جب اصفیہ برتن اٹھا کر لے گئی اور وہ بھی ہاتھ دھو کر آگئے۔ تب دوا نے منجھلے چچا کے دیے ہوئے کاغذات ان کو تھمائے۔

"یہ معین دے گئے ہیں۔" وہ رکھائی سے بولیں "دو چار دن میں وہ اپنا سامان یہاں آئیں گے۔" معظم نے کاغذات پلٹے، پڑھا اور کچھ دیر بالکل خاموش رہے۔ دوا بھی اس کے بعد نہیں بولیں۔ بستر پر لیٹ گئیں۔ وہ کچھ پچھتاوے اور ندامت کے زیر اثر وہاں کھڑے رہے۔ پھر بہت خوب" کہہ کر باہر نکل گئے۔ مگر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے برآمدے میں کرسی پر پڑ رہے۔ اور صبح تک وہیں پڑے رہے۔

صبح کی نماز کے بعد اصفیہ موسم کا جائزہ لینے باہر نکلی۔ وہ برآمدے میں کرسی پر سر پھیلائے بیٹھے تھے۔ اشارے سے اصفیہ کو بلایا۔ دوا نماز پڑھ کر سو گئیں۔ ان کے پوچھنے پر اس نے کل دن کا ماجرا کہہ سنایا اور بعد میں اضافہ کیا۔

"سب لوگ تھے۔ آپ ہی نہیں تھے۔ اتنا مزا آرہا تھا۔ سب خوب ہنسے اور خوب قہقہے لگائے۔ کلیم چچا نے لطیفے بھی سنائے۔ دوا تک ہنس رہی تھیں۔ خوب مذاق ہو رہا تھا۔"

"میں نہ تھا۔ اسی لیے قہقہے اور خوشیاں تھیں۔ میں ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔" انہوں نے تلخی سے کہا۔ اصفیہ ان کی صورت دیکھ رہی تھی۔ لہجے میں سخت بیزاری اور چہرے پر رنجیدگی اور مایوسی کے تاثرات تھے۔ ہونٹ کاٹ رہے تھے اور دور نظریں جمی ہوئی تھیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔

"یہ طے بھی کیا ہمیشہ بنائے ہیں اللہ میاں نے۔" کچھ لمحے بعد انہوں نے خود کلامی کے لہجے میں کہا۔ جھوٹے، نقلی، ظاہری۔ مگر گہرے

اور مجبور کرنے والے۔ کوئی ماں کا رشتہ ہے کوئی باپ کا۔ یہ بہن کا یہ بھائی کا۔ یہ چچا، یہ دادا۔ کیا رکھا ہے ان رشتوں میں۔ آپس میں ملتے کم ہیں۔ دور زیادہ کر دیتے ہیں۔ ظالم، بے رحم رشتے۔ دنیا داری بھی خوب چیز ہے۔"

انہوں نے ہنس کر اصفیہ کو دیکھا مگر وہ اس سے مخاطب بھی تھے یہ کہنا مشکل تھا۔ معظم اس دن ناشتے کے بعد دوا کے پاس آئے۔ سارے کاغذات ان کے حوالے کر دیے اور کہیں چلے گئے۔ اصفیہ نے جب انہیں دیکھا وہ دوا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگ رہے تھے۔

"ہمیشہ کچھ مانگنے ہی آتا ہوں آپ کے پاس۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے انداز میں کہہ رہے تھے۔ "یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ نے کبھی میری کوئی خواہش پوری نہیں کی پھر بھی کچھ نہ دینے کے باوجود معافی تو دے دیں اماں۔"

دوا نے ان کے گھنے بھورے بالوں والے سر کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا اور آہستہ آہستہ روتی آواز میں بولیں۔

"کوئی ایسی چیز مانگی ہوتی بیٹا جو میرے اختیار میں ہوتی۔ تو میں کیوں نہ دیتی۔"

"پورے خاندان کی مختار کل ہو کر بھی بے اختیار ہیں آپ۔ ہمیشہ میرے لیے ہی بے اختیار ہو جاتی ہیں۔ آپ کو کہتی ہیں اشارہ کریں تو سب لوگ آپ کے اشارے کی تعمیل میں جان بھی دے دیں۔ سب کی چاہت پر بہت بھروسہ ہے نا آپ کو۔ خیر چلیے۔ اماں میں آپ کو اس آزمائش سے بری الذمہ کرتا ہوں۔ آپ خوش ہو جائیے۔ روئیے نہیں۔ میں ہمیشہ آپ کو آنسوؤں کے تحفے ہی دیتا رہا۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ شاید یہ آخری بار کے آنسو ہوں جو مجھ سے مل رہے ہیں۔ پھر....."

وہ کچھ بے چینی سے سر جھٹکنے لگے۔ دوا نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیشانی سے گال تک سہلاتی رہیں۔

"ایسا مت کہو۔ میں ایسی خوشی نہیں چاہتی جو تم کو دور کر دے۔ چاہے میں روتی رہوں۔ مگر تم سے دوری اب برداشت نہیں ہوگی۔"

"آپ تو کہتی ہیں کہ آپ میں بہت طاقت ہے۔"

"ہاں۔ دکھ سہنے کی اب بھی طاقت ہے۔ رونے کی ہمت ہے۔ مگر ــــ تم کو نہ دیکھوں۔ وہ دن قیامت کا دن ہوتا ہے۔ تیرے لیے بری ہوں۔ تجھے کچھ نہیں دیتی۔ محبت نہیں کرتی۔ مگر پھر بھی ماں تو میں ہوں نا تیری۔ کوئی دوسری ماں تو تیری نہیں ہے معظم۔ جس پر تجھے مان ہو۔ فخر ہو ــــ ۲۱۔ بدنصیب ماں کو دکھ دینے والی ماں کچھ کر کے ہی اپنی صورت دکھاتی ہے تو زندہ ہو جاتی ہوں میں۔ میری زندگی بھی کیا ہے تو کہتی ہیں۔ یہ میں نہیں جانتی بیٹا۔" دوا کا چہرہ کس اندرونی تکلیف سے سفید پڑتا جا رہا تھا۔ معظم کے چہرے پر بھی پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ دوا کے ہاتھوں سے اپنا وجود چھڑا کر وہ بہت تیزی سے باہر کو لپکے گئے۔ دوا پلنگ پر گر گئیں۔ پھر جب تک اصفیہ ہی اس نے انہیں نہیں دیکھا۔ دوا اب بہت کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ اصفیہ ان کی رازدار، غمگسار اور مددگار تھی۔ پوری توجہ گرفتاری اور خدمت کرتی۔ اور اب اس کا داخلہ کالج میں ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کو پاس ہو کر بھی خوش تھی۔ دوا بھی بہت خوش ہوئیں اور ان کی صحت بھی اس خوشی میں بہتر ہوگئی۔ یا شاید معظم کے گلاب خواب بھرنے لگے تھے۔

انہی دنوں ایک روز سلومی آئی۔ جمیلہ اپنی ماں کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی۔ دوا اصفیہ کی تلاش میں ادھر آگئی۔ اصفیہ امرود کے درخت پر پکے امرودوں کی تلاش میں نظر دوڑا رہی تھی۔ کہ نیچے سے اشرفی کی آواز آئی۔ جھک کر دیکھا تو شاخوں پتوں کے درمیان نیچے سلومی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اوپر دیکھ رہی تھی۔ اصفیہ جلدی سے نیچے اتری اور جب وہ کود کر زمین پر آئی تب اس نے سلومی کے پیچھے کھڑے چاند کو دیکھا جو اصفیہ کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کا جسم کچھ اور بھر گیا تھا۔ مونچھیں بھی گہری بھوری اور گھنی ہو گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آج بھی تمسخر تھا۔ سلومی نے اپنے آنے کا مقصد بتانے کے بعد پوچھا۔

"تم کبھی آتی نہیں ہو۔ کیا کرتی رہتی ہو؟"

چاند نے ہنس کر درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"دیکھ تو رہی ہو۔" پھر اصفیہ سے مخاطب ہوا۔ "میں سوچ رہا ہوں تمہیں جوڈو کراٹے سکھانے کے بدلے تم سے درختوں پر چہل قدمی کرنے کی ٹریننگ لے لوں۔ ہنر تو کام آتا ہی ہے۔"

اصفیہ نے نظریں چرائیں اور دوپٹے کے پلو میں سے امرود نکال کر انہیں دیے۔ جاتے ہوئے چاند نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"آؤ گی نا؟ میں۔ میرا مطلب ہے ہم انتظار کریں گے بھیا بھی کہہ رہے تھے کہ امی بھی تم کو.... میرا مطلب ہے کہ پسند کرتی ہیں۔" وہ کچھ ہکلانے لگا۔ کیونکہ سلومی معنی خیز نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"تم اس دن پارٹی سے بھی بھاگ آئی تھیں؟" سلومی نے شکوہ کیا۔ "ہوا کیا تھا؟"

چاند نے گڑبڑاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"چوٹ لگ گئی تھی انہیں؟"

اصفیہ بڑی دیر تک گم صم ہیرا ن کھڑی رہی۔ پھر اس نے بے حد سادے دھونے لگا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈا گئیں تو وہ زمین پر بیٹھ گئی اور اگلی سے زمین پر کچھ لکھنے لگی۔ بڑبڑاتی رہی وہ چاند کا نام بار بار لکھ رہی تھی۔ چاند۔ چاند۔ چاند۔

اچانک ایک دن آپا آگئے۔ وہ کتنے بدلے آئے تھے۔ دو ماہ کو طبیعت درست رہی۔

"ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اسے کچھ پڑھنے تو دو۔ سیکھنے دو۔ دو کوڑی کی بڑھیا تھی جیسی کیسی یہاں ماری ہے تب آدمی کا بچہ بنی ہے۔ ایف۔ اے تو کرنے دو؟"

گرآپا کا ایک ہی رٹا رٹایا سبق تھا۔ "لڑکے والے یہاں کو آرہے ہیں۔ اچھی خاصی گرہستی ہے۔ میں بھی فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں؟"

علیم بھائی کی سفارش بھی بے کار گئی۔ وہ دوڑی گئی، بڑے بھائی کے پاس۔ دونوں بھائیوں نے مل کر آپا کو سمجھایا۔ لیکن آپا نے کہا۔ "ایسا بھی کہاں ملے گا۔ وہ کہتے ہیں ابھی شادی ہوئی تو ہوگی دو برس بعد۔ ہمیں اور کرنی ہے۔ اصل میں قابل، لائق لڑکا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اور لگا رہے ہیں۔ لالچ دے رہے ہیں۔ انہیں رشتوں کی کیا کمی؟ لڑکی کا بوجھ بہت بھاری ہوتا ہے بڑے بھیا! میں نے تو طے کر لیا تھا کہ واپسی پر شادی کروا دوں گا میں نے خود ہی تحریک کی تھی۔ اب کیا جواب دوں۔ انعام کی وجہ سے انکار کر دوں۔ پھر کہاں ایسا رشتہ ملے گا۔ آپ بھی مشیروں والے ہیں۔ سوچیے۔"

بڑے بھائی کہہ سکے کہ تم نے کس دن لڑکی کا بوجھ اٹھایا ہے کہ ابھی سے تھک گئے۔ وہ روہانسی آپا کے کمرے میں آگئی۔ امی نے بڑھ محبت کا اظہار کیا۔ بھائیوں نے حاطہ توانائی کی حد کر دی۔ لیکن اسے کچھ بھی اچھا نہ لگتا۔ آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں اور وہ خود ایک بھاری پتھر۔ حرکت و شور ہو گئی۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ پتہ نہیں دل میں کیا کیا آتھل پتھل ہوتی۔ لگتا تھا کوئی کمی سی۔ دو ای تھیں۔ ان کے گھر کی ہستیاں۔ ننھا کے گھر سے دو آ کے گھر کا سفر ہزاری کا سفر تھا۔ اور دو آ کے گھر سے آپا کا گھر ایک گہری خلیج تھی جس کا کنارہ نہ تھا۔ روشنی نہ تھی۔ کوئی تو شبو تھی نہ آواز دوں کا سکیں۔ اس کی سسرال کے لوگ بھی آتے۔ خوب خاطر مدارات کی جاتی مگر وہ اپنی جگہ سے ہلتی بھی نہیں تھی۔ خس بیٹھی رہتی

دے۔ اتنی بات سے بھی کوئی محبت نہ ہوتی جو وہ اس کا بہت خیال رکھتے اور وہ بھائی جن پر اتنی کو بے حد فخر تھا۔ اسے خدا بھی پسند نہ آتے۔ خواہ مخواہ اس کی خوشامد میں لگے رہتے۔ جاہل کہیں کے۔

پھر ایک دن پتہ چلا کہ وہ لوگ یہاں کو کوٹھی سے آنے کی عادت نہیں ہے۔ چھوٹی بڑی خلش نہیں۔ اب تجارج ٹیلیفون پر ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ رخصت ہو کر سسرال جائے گی پھر جب وہ آئیں گے تب دیکھ لیں گے۔ ساتھ لے جائیں گے یا پھر یہیں رہ جائیں گے۔ یہ لوگ ان کے آنے پر ہی ہوگا کہ لڑکی جائیں یا نہیں کاروبار کریں۔ وکیلاں تو بے شمار حاصل کر چکے ہیں مگر وہاں جتنی آمدنی تو یہاں نہیں ہوگی۔ اس لیے کاروبار کا ارادہ ہے مگر کچھ طے نہیں ہے۔ اصفیہ نے غصے میں امی سے کہا۔ "تو ایسی آفت کیا تھی وہاں سے جانے کی جب وہ آجاتا تو ہم بھی آجاتے؟"

امی دوپٹے میں گرتا نگاریں تھیں۔ بھیں نہیں۔ بولیں۔

"کون آجاتا؟"

اصفیہ نے بے دھڑک کہا "وہی بدبخت جس سے جانا نکاح ہوگا اور کون؟" اس کا منہ کڑوا ہو گیا۔

امی نے دوپٹہ ہاتھ سے پھینکا رکھا اور دھڑکے طاق پر رسید کیا اس کے گال پر۔ اس کا منہ پھر گیا۔

"بدبخت کہہ رہی ہے کمینی۔ ارے شوہر تو مجازی خدا ہوتا ہے۔ یہ کیا جانے دو آ کے ہاں اتنے دن میں۔ ہمیں ہری طرح غصہ آگیا۔

"تو ابھی کہاں ہوا ہے وہ شوہر؟" وہ بلا کر بولی۔ طمانچے نے اسے بھی آگ بگولہ کر دیا تھا۔ آپ ہی کہتی تھیں کہ جس سے بیاہا جائے گا وہ بدقسمت ہوگا، اس لیے ہم نے کہا اور اب بھی کہیں گے کمبخت۔ بدبخت۔"

امی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ جواب نہ سوجھا۔ پھر بولیں۔

"زبان کھینچ لوں گی۔" یہ کہہ کر بے بسی سے دوپٹہ اٹھا کر ٹانکنے لگیں۔ وہ پیر پٹخ کر کمرے سے نکل گئی۔ اور بڑبڑاتی رہی۔ اس بدبخت کو کوسا رہی۔ جس کی وجہ سے وہ جہنم میں پھینکی جا رہی تھی۔ شادی کے دن قریب آگئے۔ ماموں ممانی بھی آگئے۔ ان کے دونوں بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی۔ دونوں بہوئیں ساتھ آئی تھیں۔ اصفیہ نے ان کے ساتھ بڑے سال گزارے تھے۔ بھائیوں کی شادی کی اسے خبر ہی نہ دی گئی۔ ممانی نے اس کے شکوے پر کہا کہ ہم نے تو شبانہ سے کہا تھا۔ اصفیہ کو بلوا لیں

بھائیوں کی ایک ہی بہن ہے۔ شادی پر ہونا چاہیے مگر بھی شادی کے لوگ پر بھروسہ نہیں کرتی ہوگی باتیں اور عزیز کر کے بھی شرمندہ کرتے ہیں اور ان دونوں نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ سوچا کہ بعد میں بلا لیں گے پھر اسے کام میں دلچسپی ہو گئی۔

"اب بھی تو لگا کے دو طمانچے کے بعد میں جا رہے ہیں۔" اس نے بگڑ کر کہا۔

ممانی نے ڈانٹ کر کہا۔ "تمہارے ہونے کی بھی بہت ضرورت تھیں۔ اور ہم سب کو تمہاری کمی محسوس ہوئی۔ مگر صفیہ بیٹی کرنے جب شادیوں میں تمہیں بلانے کے حق میں نہیں تھیں۔ بھائی تو کہتا تھا چاہے دو دن کے لیے بلا لیا جائے۔ رہ جائے۔ محبوب نے کہا۔ "ہاں تو بہار آرہی تھی۔ کر لیتا ہے۔"

اصفیہ خوب جانتی تھی کہ ممانی نے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہر بات میں بھی لگی ہوتے ہیں۔ بھائی دنیاداری کے۔ پتہ نہیں کیوں ایسے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا بیٹا نہیں ہوتا۔ سب اپنے لگے ہوتے ہیں شادی والے دن آپا اور بھیا کے ساتھ تھیں اصفیہ بہت خوش تھی کہ چلو اچھا ہے جیسے تیسے کی کوئی ہو گئی ہیں۔ بہت کمزور ہیں۔ سفر کے قابل نہیں ہوں گی۔ بھیا نے بتایا۔ "ہنا بستا اچھا گھر ہے۔ ساتھ خاندان کی میں شادی کے سلسلے میں۔ اور شفق کے چیک نکل آئی ہے۔ اس لیے امی نہیں آئیں بڑی پھپی دادی اماں کے ساتھ رہے تھی۔ بہار ہیں اصفیہ۔ تمہیں اور چھوٹے چچا کو کہ کے تھی ہیں۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا دادی اماں کے گھر اس حالت میں چھوڑ کر آنے کا۔ مگر انہوں نے زبردستی بھیج دیا ہے کہ اصفیہ کو لے کر ہی آنا۔ اگر کوئی نہ گیا تو بہت ہی دکھائیں انہوں نے تمہارے لیے بھیجی ہیں۔"

اصفیہ کا دل بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دل ہی دل میں اس مردود کو کوسنے لگی جس کی وجہ سے وہ اپنی دنیا کو چھوڑ کر آئی۔ کمبخت مر ہی جائے۔ بھیا چھوٹے۔ انیسٹنٹ ہی ہو جائے کہ شادی ہی نہ ہو۔ یا ہیضہ نکل آئے کہ بارات لوٹ جائے کا تصور ہی نہ ہو۔ مگر بارات آتی ہے۔ کیا وہ تو وہاں بیٹھا ڈکریاں بھون بھون کر چیخ رہا ہوگا۔ ٹیلیفون پر نکاح ہوگا۔ ابا بھی خوب ہیں۔ چاہے کوئی فون پر کہہ دے منظور ہے منظور ہے۔ اور نکاح ہو جائے۔ یہ خیال آتے ہی دوڑی امی کی طرف۔ ہاتھوں میں مہندی۔ پیلے کپڑوں میں کچھ کی خوشبوئیں بسی دھم دھم زینہ اترتی۔ امی کو پکارتی ادھر سے ادھر پھر رہی تھی۔ یہاں ہے یہاں ہے کی صدا میں سن کر گھبرا کے بیٹھی ہی تھیں۔ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"کیا ہوا؟ دھوئیں کون ہے؟ نکل آئی ہیں۔ پھر کسی سے جھگڑا کر کے آگئی ہیں۔ کہہ دیا تھا کہ ہم نہیں آئیں گے۔ ہمارا کام ہو جائے گا۔ سوچ لیں گے۔ اس سے کہہ دیا تھا۔ ہم نہیں آئیں گے۔ پھر کیا ہوا؟"

امی کی بڑبڑاہٹ سن کر بھی وہ کچھ نہ بولی۔ بس روتی رہی۔ امی کو تشویش ہوئی۔ ہمت کر کے اٹھیں۔ اس کے پاس آئیں۔ سر پر ہاتھ رکھا۔ پیار کیا۔ تو وہ ان سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ امی کو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ بھی رونے لگیں۔

"ہائے کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ گی بھی۔ کیا ہوا ہے؟"

بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ وہ بات نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ ابھی نہیں کرے گا۔ ہر کسی سے آگے بات کرتی ہے۔ کہتا ہے کہ وہاں بھی ایسی لڑکیاں ہوں گی۔ ابھی سے نخرے کرتی ہے۔ وہ بھی یہ سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔ ابھی نے نسبت

ہی عزت ہوتی۔

حواس مزاک۔ ابا کے محسوسات پر کوڑے برس رہے تھے۔ ان کی بنائی عزت کو قدموں تلے روندا جا رہا تھا۔ وہ سوالات کے جوابات دیتے دیتے پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ توہین اور ذلت کے احساس نے انہیں نڈھال کر دیا۔ آخر زچ ہو کر انہوں نے کہہ دیا۔

"میرے پاس تو یہی کچھ ہے۔ میں نے حلال کی روزی کمائی تھی کہیں سے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا۔ اس سے زیادہ میں نہیں دے سکتا۔" وہ سر تھام کر زمین پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے بے نیازی سے کہا "تو پھر ہمیں فون کر کے اپنا انتظام کرنے میں لگ گئے۔ اسے تو کیپٹل کی توقع بھی تھی۔ وہ یہاں آ کر کاروبار کرنا چاہتا ہے۔"

سمدھیانے والے واپس چلے گئے۔ سارا گھر صحن میں پڑا ہوا تھا۔ ابا کمرے میں پلنگ پر بیٹھے اس اور غم سے چور پڑے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ اب کیا کریں۔ بڑے چچا انہیں برابر سمجھا رہے تھے "قسمت میں یہ شادی ہو گی تو اوپر کا اقرار کرنے کا تم کیوں خود کو گھلا رہے ہو۔ اللہ کی طرف سے امید رکھو سب بہتر ہی ہو گی۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ابا نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "ان کا وہی جواب ہو گا جانے سے پہلے ان کے ایک عزیز نے مجھے چپکے سے بتایا تھا لڑکے کا بھی مطالبہ ہے اسے بڑی رقم سلامی میں ملے گی۔ وہ چاہتے ہیں جتنا خرچ اس کی تعلیم میں ہوا ہے وہ سلامی کے ذریعے میں انہیں دے دوں۔ غرض میری ہے۔"

بڑے چچا نے سختی سے کہا "پھر تم خود ہی پہل کرو۔ اس سے پہلے کہ وہ آ کر تمہیں الٹی کار کر دے۔ لڑکی لوگ ہیں۔ بہت پچھتاؤ گے تم۔"

"مگر۔۔۔ میں مٹی والا ہوں بڑے بھیا۔ اپنے منہ سے کیسے۔۔۔؟"

"تمہاری بیٹی کی زندگی آئی سستی نہیں کہ اسے اپنی اکن اپنی زبان پر قربان کر دو۔"

"بڑے بھیا۔۔۔ وہ۔۔۔ شہرت ہو جائے گی۔ لوگ باتیں کرنے لگ جائیں گے۔ لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ بھی مٹی والے ہیں۔ جانتے ہیں کہیں سے، کہیں سے، تھوڑا بندوبست ہو جاتا تو میں اتنا ذلیل نہ ہوتا۔ میں نے اپنی بیٹی کے لیے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ اس کی خوشی کے لیے!"

"اس خواب کی تعبیر بہت بھیانک ہے شفاق۔" بڑے چچا نے انہیں سمجھایا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تم اسے کسی جاہل مزدور سے بیاہ دو۔ جو اس کی قدر کرے۔"

"میں نے تو تعلیم یافتہ خاندان چنا تھا۔ کیا غلطی کی میں نے؟"

"اس تعلیم سے کچھ نہیں ہوتا جو انسان کو جہالت کی تاریکیوں میں قید رکھے۔ یہ انسانیت کی تذلیل ہے اشفاق۔ بس ہمت کرو۔ دل کو سنبھالو۔ جو ہو چکا اب اس سے زیادہ نہیں ہو گا۔ تمہاری عزت اسی میں ہے کہ خود انکار کر دو۔"

وہ بچوں کی طرح رو دیئے۔ "کیا کروں۔ میں کیا کروں کیسی مشکل ہے اے خدا مجھے اس مشکل سے نکال۔ میری بیٹی کی بہتری کے لیے تو کوئی معجزہ دکھا دے۔"

بڑے چچا کھڑے ہو کر سنجیدہ لہجے میں بولنے لگے "بیٹیاں بہت قیمتی متاع ہوتی ہیں اشفاق۔ انہیں رائیگاں نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ ان کو نعمت بنا کر ہمارے پاس بھیجتا ہے اور کفرانِ نعمت اسے پسند نہیں۔ اپنی تذلیل پر نہیں بیٹی کی زندگی پر نظر کرو۔ کیا وہ ایسے اچھے، جاہل لوگوں کے درمیان خوش رہ سکتی ہے۔ اس کی زندگی تباہ نہ کرو۔ پھر انہوں نے اصغری بی سے پوچھا۔ "تم کیا کہتی ہو شہناز؟"

گھر پر اداسی کے سائے لرز رہے تھے۔ بھیانک اور ہیبت ناک اندیشے۔ پورا ماحول سوگ میں لپٹا ہوا فریاد کر رہا تھا۔ سب کے چہرے زرد تھے اور جسم خوف سے کانپ رہے تھے۔ درد نے احساس کی حدوں کو چھو لیا تھا۔ بہت سے مہمان موجود تھے۔ کچھ جا چکے تھے مگر سب کے لبوں پر خاموشی تھی۔ زبان سے کوئی کچھ پوچھتا تو درد و غبار گونجنے لگتے۔ گزرتا وقت، سرکتے لمحے بھیانک تعبیر کو قریب لا رہے تھے۔

ابا پریشان تھے چہرا زرد۔ اور وہ یوں لرزنے لگے جیسے تیز بخار نے آن دبوچا ہو۔ ان کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ بولنے میں دقت ہو رہی تھی اور وہ وحشت سے پھٹی آنکھوں کو بے ضرورت ادھر اُدھر گھما رہے تھے۔

"بارات واپس جائے تو کیسی بدنامی ہوتی ہے۔"

"اب بھی نہیں سمجھ رہے ہو تم اشفاق۔ تم انکار کرو گے تو تمہاری عزت رہ جائے گی۔ ہاں البتہ وہ آ کر کہیں گے کہ ہم نے جو چاہا منوا لیا ہے اور ہم اپنی شرط جیت چکے ہیں۔ پھر تم کیا کرو گے؟"

امی نے اپنی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے رگڑیں۔۔۔ اور صاف آواز میں بولیں۔ "میں خود جا کر بات کرتی ہوں۔ ہماری بیٹی ہمیں دو بھر تو نہیں۔"

ابا چونک کر سیدھے ہو گئے۔ "اچھا۔ طارق سے تو مشورہ کر لیا کہ کیا کرنا ہے؟"

"بتا دیں گی۔ خدا کا شکر ہے کہ وقت سے پہلے وہ کالا دھبہ سامنے آ گیا۔ ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے۔" امی نے آنکھیں رگڑ کر صاف کرتے ہوئے کہا۔ پھر ابا کے پاس سے اٹھ کر انہیں سمجھانے لگیں۔ چلتے ہوئے کہا۔

"میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ۔"

"نہیں۔ اکیلے میں بات کریں گے۔ سب سامنے بیٹھے ہوں گے تو انہیں کہیں بھاگنے کا راستہ نہ مل جائے۔"

اصغری بی نے بات کاٹی "اور پھر کہیں انہوں نے ہمارے مدد کرنے پر ہی ہاتھ ڈال دیا تو۔۔۔ پھر ہم کیا کر لیں گے۔"

"ہاں۔ اب آپ چلیں۔ ابا کے پاس بیٹھیے۔"

اور اس رات کے پچھلے پہر جب گھر کی ساری بتیاں بجھ گئیں اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ امی نے ابا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابا نے دروازہ کھولا۔ امی کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنے آئی ہیں۔ وہ بستر پر بیٹھ گئے۔ امی ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ ابا نے ان کا ہاتھ تھام لی

سے دور بھیجا جائے تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

اصفیہ دور بیٹھی تھی مگر اس کے کان اسی جانب لگے تھے۔ تو وہ آخری چاند ڈوب گیا۔ اُسے افق کی پہنائیوں میں پہنچا کر تاریک راستوں پر چھوڑ کر۔ کتنی دیر وہ سُن دماغ لیے بیٹھی رہی اس کے کرنے کی کوئی بات نہ تھی۔ اس لیے وہ بہت حوصلے کے ساتھ اُٹھ کر آ گئی۔ سب لوگ شادی کے کاموں میں منہمک تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ لگ گئی۔ چپ چاپ۔ کس سے فریاد کرے کس کو رازدار بنائے۔ اور اب تو کچھ رہا بھی نہیں۔ سب ـــــ بیکار گیا۔

رات بہت اندھیری تھی۔ تنہائی اور خاموشی۔ وہ مجھے دل سے پرچھائی کر رہی تھی۔ دوا نے بڑے پیار سے کہا۔ "اصفیہ بیٹی ـ! بہت دل گھبرا رہا ہے۔ ذرا ستار تو بجاؤ۔ معظم بجاتا تھا تو میں غضا ہوتی تھی۔ اب دل چاہتا ہے وہ آ جائے۔ ستار بجائے۔ بکور مچائے۔ لڑے، جھگڑا کرے۔"

اصفیہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "ہاں بیٹی۔ تم میرے لیے معظم سے کم نہیں ہو۔ اس کے بعد پھر میں نے تم سے ہی محبت کی ہے۔ کسی خوف کے بغیر میں نے تمہیں چاہا ہے۔ اور تم نے مجھے جو کچھ دیا ہے وہ معظم بھی نہیں دے سکا۔ سچ کہہ رہی ہوں۔" اصفیہ نے پلکیں جھپکائیں۔

"دوا! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟"

"ایک بات پوچھنا چاہتی تھی تم سے۔ ہمت نہیں پڑتی۔"

"ارے دوا! کیا بات ہے۔ بولیے نا!"

"بیٹی! تمہیں شادی کے نہ ہونے کا بہت رنج تو نہیں ہوا؟"

"نہیں تو دوا! بلکہ ہم تو دعائیں کرتے تھے کہ کسی طرح کچھ ہو جائے اور ہم آپ کے پاس آ جائیں۔" دوا خوش ہو گئیں۔

"ایک بات اور بھی ہے بیٹی!" وہ پھر ہچکچائیں۔ "کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ کہو گی دوا کی دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ توبہ دوا! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ کہیے نا!"

"بیٹی! اصل میں بات یہ ہے کہ اس بار جو معظم تجھ سے خفا ہو کر گیا ہے تو وہ ستار ہی وجہ ہے۔" دوا نے اصفیہ سے نظریں چرائیں۔ اصفیہ حیران ہو کر انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ہاں بیٹی! اس نے مجھ سے تمہارا ہاتھ مانگا تھا۔ میں نے اسے بتایا۔ یہ کسی کی امانت ہے۔ میں اشفاق کی نظروں میں شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔ بگڑتی نہ ہوتی تو میں کہہ سکتی تھی۔ اسی پر وہ خداخوش ہوگی اگر میں سب کی خواہش پوری کرتی ہوں۔ دعوے کرتی ہوں کہ سب میرے اشاروں کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر میں کسی کے لیے کچھ نہیں کرتی۔ کسی سے کچھ منواتی نہیں۔ سب کی ناحق ہوں۔ بیٹی! میرا معظم بہت غیرت والا ہے۔ وہ بے حس نہیں ہے۔ اس دن معین کے سب کاغذات واپس کر گیا۔ اسے اپنی خوشی کے لیے دوسروں کو بے چین کرنا گوارا نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے ایسی چیز مانگی جو میں اُسے چاہتے ہوئے بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اشفاق نے بتایا تھا وہ لڑکا اظہر وہاں انگلینڈ اور کینیڈا میں ڈگریوں پر ڈگریاں بٹور رہا ہے۔ لائق ہے۔ ذہین یافتہ ہے۔ میرے معظم کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ میں کس منہ سے اشفاق کے سامنے ہاتھ پھیلاتی۔ وہ چلا گیا روٹھ کر۔ مگر آئے گا ضرور۔ ماں کو لانے کے لیے ہی سہی۔ آئے گا بیٹی۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ میں نے ایک خط اشفاق کو لکھا ہے۔ تمہیں مانگا ہے۔ معظم کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے بیٹی۔ بڑھاپے نے مجھے خود غرض بنا دیا ہے۔ تمہارے واسطے سے معظم کو واپس لانا چاہتی ہوں۔ میں اسے واپس نہیں لا سکتی۔ تم ہی لا سکتی ہو۔ اگر تمہیں یہ منظور نہ ہو تو ضرور عایت نہ کرنا۔ تمہاری زندگی، تمہارا مستقبل بھی مجھے اتنا ہی عزیز ہے۔ میں اپنی خدمت کے لیے تم کو اشفاق سے اُدھار مانگ سکتی ہوں۔ نہ سہی معظم۔ تم کچھ عرصہ ساتھ رہ سکتی ہو۔ اشفاق کبھی میری بات نہیں ٹال سکتا۔ مگر پھر ـــ معظم کبھی ان رشتوں کی اہمیت کو نہیں جان سکے گا یقین نہیں کرے گا کہ میں اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی، نہ کر سکی۔ پہلے بھی جب اسے کوئی چیز پسند آتی۔ وہ اس کے بھائیوں کی ضرورت بن جاتی۔ اب ایسا نہیں ہے، مگر پھر بھی مجبور رہتی۔ آج ڈرتے ڈرتے تم سے سوال کر رہی ہوں۔ سوچ لو۔ کل۔ ہاں کل شام تک مجھے بتا دینا میں منتظر رہوں گی۔ کہو گی تو اک میں ڈلوا دوں گی۔ ورنہ نہیں۔"

اصفیہ چپ چاپ سر جھکائے ان کی لرزتی آواز سن رہی تھی۔ ان کے چہرے پر گہرا دکھ، محرومیوں کا جال اور اداسیوں کی سلوٹیں تھیں۔ اپنی ناسمجھ کسی پر نچھاور کر دینے والی ماں اپنے بیٹے کو ہی خالی ہاتھ لوٹا رہی تھی۔ اصفیہ چپ چاپ ہونٹ کاٹتی رہی۔ سوچتی رہی۔ ٹیپ چلتا رہا۔ کتاب کھلی رہی مگر وہ ایک حرف بھی نہ پڑھ سکی۔ سنا ہی سنا تھا۔ ہر جانب سناٹا۔ صبح وہ کالج نہ گئی۔ پچھلے برآمدے میں پلنگ پر پڑی رہی۔ دوا سمجھ رہی تھیں وہ سو رہی ہے مگر اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ آنکھوں کے سامنے تصویریں سی گھوم رہی تھیں۔ جب معین پچانے دوا کے سامنے سر جھکا کر اعتراف کیا تھا۔ وہ کس قدر خوش ہو گئی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات سے انہیں کیسی خوشی ہوتی تھی۔ خوش ہو جانا ان کی فطرت ہے مگر وہ کسی سے توقع نہیں کرتیں۔ کوئی ان کو عزت محبت دے، اس کا

احسان مانتی ہیں۔ فکر کرتی ہیں۔ جانے کتنی محرومیوں کے بعد انہوں نے صبر کو شعار بنایا ہے۔ یہاں تک کہ شریک کیلئے بھی خوشی محسوس کی تھی۔ اس عورت کے ساتھ وہ زندگی گزار رہی تھی۔ دوا سے اسے بے حد انس تھا۔ وہ ان کی ہر خوشی پر پھولے نہ سماتی تھی۔ وہ ان کی ہر خواہش پوری کرتی تھی۔ وہ ان کے لیے ہر چیز جائز تھی۔ ہر ناجائز، جھوٹ، بے ایمانی، ہر حرکت جو مشفق بیٹی، مخلص کے ذہن میں آ سکتی تھی۔ اصفیہ ارکیوں کے ساتھ مل کر ان کی صفائی کر رہی تھی۔ رات کے کھانے پر جمیلہ کی سسرال والے آنے والے تھے۔ دوا ان میں کھانے کا انتظام کر رہی تھیں۔ گیٹ سے سفری داخل ہوئی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اصفیہ کو دیکھ کر اس کی طرف چلی آئی۔ ادھر اُدھر دیکھ کر اس نے بیگ سے ایک کاغذ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور کان میں بولی۔

"آج فون آیا تھا۔ تمہارا پوچھ رہے تھے۔ آج ہی میرے نام خط آیا ہے۔ میں نے سوچا یہ اچھا موقع ہے۔ سب کام میں لگے ہوئے ہیں۔ خط دے آؤں۔"

کہہ کر تیز تیز قدم رکھتی باہر چلی گئی۔ اصفیہ متحیر سی اسے دیکھتی رہی۔ جو اندھیرا چھایا تھا طاب رفتہ رفتہ چھٹتا جا رہا تھا پھر اب نئے سرے سے وہ کس راستے پر چلے ـــ طرح طرح کے سنگ میل۔ وہیں شفق کی روشنی میں اس نے کاغذ کھولا۔ چند لائنوں والا وہ خط۔

"میں بہت جلد آؤں گا۔ تین سال بعد۔ انتظار کرنا۔ جو ڈرائے ہی نہیں اور بھی بہت کچھ سکھا دوں گا۔ یہاں خاصی ٹریننگ ہو رہی ہے۔ تم انتظار کرنا۔ دیکھو ستارا بجوانا نہیں۔ تمہیں کا صرف ستارہ ہے ـــ چاند۔"

اصفیہ نے بکھرے سر کو تھام لیا۔ وہ سر سے ہاتھ سے ہٹانا چاہتا تھا۔ قریب ہی ایک سرخ گلاب تھا۔ اس نے اس سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ چاند ڈوب گیا تھا۔ تاریکی گردش میں ہے۔ کون کس کا انتظار کرے؟

ذرا سستا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ پیڑ سے کونپلیں تو دیکھ وہ خوبی کا پیڑ ہے۔ شاخیں مضبوط۔ گھنی اور گہرے سبز رنگ کے پتوں میں گندھی ہوئی۔ وہ اس عرصے میں کافی بڑا ہو گیا تھا۔ کئی شاخیں پھوٹ آئی تھیں۔ شاید اس سال فصل بہار پر زیادہ پھول آئیں۔ مضبوط اور توانا۔ اس کا پودا جس خوب پھلے گا۔ بڑھے گا۔ بڑے بچوں کی آنکھ سے اوجھل ہو چکی تھی اور اب اشفاق تو کے بیٹے ہیں

سے جا چکے تھے۔ اصفیہ کتنی دیر وہاں کھڑی رہی۔ وہ نہیں جان سکی۔ شاید اس کی زندگی میں خزاں آنے والی تھی۔ کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر اس نے پڑھا اور کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دیا جو لوگوں نے جمع کیا تھا اور جس کو عزت نے ماچس دکھا دی تھی۔

خیالوں کے تسلسل سے ذہانت کر اس نے کروٹ لی تو دوا کی نظروں سے آنکھیں ملیں۔ وہ جھینپ گئی۔ دوا کے ہونٹوں پر شفقت کی ہلکی سی مسکراہٹ میں ڈھل گئی۔ "دوا! آپ خفا تو نہیں ہوں گی نا؟"

فاتون کا دسترخوان

کھانا پکانے کی مزیدار ترکیبوں کی رنگارنگ کتاب

ملنے کا پتہ: ۳۷ نسبت روڈ لاہور